ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۲۴/جون ۹۶ء

☆ اگر پاکستانی قومیت جائز ہے تو بنگالی یا سندھی کیوں جائز نہیں؟
☆ اقبال "دار الاسلام" کو اپنا مقصود حقیقی بنائے ہوئے تھے
☆ یاسر عرفات عرب دنیا کے مایوس ترین انسان ہیں

حدیث امروز

سیاسی طوفان

جنرل (ر) محمد حسین انصاری

دنیا بھر میں جہاں قانون کی بالادستی کو اصولی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے وہاں قومی روایات بھی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ بسا اوقات یہی روایات قانون سازی یا قانون میں ترمیم کا باعث بنتی ہیں۔ قومی روایات ہی کسی قوم کی نفسیات' تہذیب' ثقافت' شعور اور مستقبل کا پتہ دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ ملکی قوانین بھی انہی کیفیات کا مظہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے ہماری بھی روایات ہیں اور سیاست میں سیڑھی چڑھے کی ٹانگ کھینچنا انہی میں سے ایک روایت ہے۔ ہم سیاسی میدان میں اکھاڑ پچھاڑ کے دلدادہ ہیں۔ ہمیں جمہوری سکون پسند نہیں آتا۔ ہم سیاسی اختلاف کو ذاتی مخالفت کا رنگ دینے میں ماہر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچاس سالہ قومی زندگی میں کوئی حکومت باعزت طور پر گھر کو نہ لوٹی۔ کوئی مارشل لائی طوفان کی نذر ہوئی اور کوئی سیاسی طوفان کی بھینٹ چڑھی۔ صدر ضیاء الحق کے "کریش" کے بعد کے سیاسی منظر سے پتہ چلتا ہے کہ جمہوری عمل میں ہماری قومی قوت برداشت دو اڑھائی سال سے زیادہ نہیں۔ ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء کی منتخب حکومتوں کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ البتہ اس بار سیاسی افق پر طوفان اٹھے کچھ دیر ہو گئی ہے۔ تحریک نجات کے ذریعے سیاسی طوفان برپا کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی مگر وہ پروان نہ چڑھ سکی اور یوں موجودہ حکومت نے اڑھائی سال مکمل کر ہی لئے ہیں۔ تاہم نفرت کی چنگاری اب بھی سلگ رہی ہے۔ برسوں "کھوٹے سکے کے دو رخ" کی مسلسل رٹ لگانے کے باوجود نورانی نواز ملاقاتیں اور بجٹ پیش ہونے سے قبل آل پارٹیز بجٹ کانفرنس کے اسلام آباد میں انعقاد کا اعلان حکومت ہٹاؤ پروگرام کی جزئیات ہیں۔ ثقافت کی آڑ میں ٹیلیویژن پر سجا سجایا کنجر خانہ پیش کرنے کی مذمت' ججوں کی تقرری کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے پس منظر میں معاندانہ ردعمل' اذان بج رہا ہے کے جملے پر پھبتیاں' سابق وزیر اعلیٰ منظور احمد وٹو کی سپریم کورٹ میں اپیل پر متوقع فیصلے کے ضمن میں قیاس آرائیاں' ایوان اقتدار کی زینت اور پرجوش سیاسی مقتدر کی رہائی کے بعد اخلاق سوز محاورات کا تبادلہ' مہران سکینڈل' آزادی نسواں کی آڑ میں خاندانی نظام تباہ کر دینے کی امریکی سازش میں حکومت کی ملی بھگت' توہین رسالت کے بارے میں قوانین کے حوالے سے مداخلت' اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کا حق' کلرکوں کی ہڑتال' احتسابی کمیشن کے قیام کا مطالبہ اور اب قومی بجٹ پر اشتعال انگیز تبصرے سب ایسے بگولے ہیں جو خرابی موسم کا پتہ دیتے ہیں۔ ۲۴ جون کو قاضی حسین احمد کی جانب سے قومی اسمبلی کے گھیراؤ کا اعلان بھی ہو چکا ہے۔ دیکھیں ہوا کونسا رخ اختیار کرتی ہے' مخالفانہ یا موافقانہ۔ ممکن ہے انگلینڈ میں شاہانہ محل کی خریداری اور میراج طیاروں کا سودا ہی موت کا کنواں ثابت ہوں۔ غرضیکہ سیاسی افق پر سیاہ بادل کی اتنی ٹکڑیاں گھر آئی ہیں کہ اب کچھ نہ کچھ ہو کر ہی رہے گا۔ ایسے سماں میں وقت شناس لوگ تاک لگائے بیٹھے ہیں۔ کچھ اقتدار کی کرسیوں پر منتقل ہونے کی امید لئے' کچھ گرگٹ کی سی مہارت کے چکر میں اور کچھ تماشائی انداز میں۔ بس اس سے آگے بات کرنے پر ارباب علم و دانش تیار نہیں۔ اگرچہ زندگی کی کہانی کو آگے چلنا ہے مگر اتنی دور کی سوچ سوچنا ہماری ریت نہیں۔ ہمارا وتیرہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دیدہ دانستہ حکم عدولی اور اس کے نتیجے میں اپنی روسیاہی سے قطع نظر اللہ کے حضور ہر لمحہ دعا کے لئے ہاتھ رسا بلند کرتے ہوئے ہر معاملہ قدرت کے کھاتے میں ڈال کر خود کو بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ محض تنقید کرنے کی بجائے ان خوفناک صورت اختیار کر لینے والے مسائل کا کوئی متبادل حل پیش کیا جاتا۔ قوم کی رہنمائی کا فریضہ ہر اس شخص پر ہے جو راہنما کہلاتا ہے' اقتدار میں ہو یا اپوزیشن میں یا کسی اور انداز میں قیادت کا سہرا سجائے۔ اللہ رب العزت کا یہ ارشاد ملحوظ خاطر رہے۔ (ترجمہ) "اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے"۔ (الانفال : ۲۶)OO

قیمت : ۸ روپے

الہدیٰ

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں۔

(سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات میں تعمیر سیرت کی اساسات یعنی ایک بندۂ مومن کے سیرت و کردار کے بنیادی اوصاف کا ذکر تھا تو ان آیات میں ایک پوری طرح تعمیر شدہ شخصیت کے خدوخال کا بیان ہے۔ کہ رحمٰن کے محبوب بندے تو وہ ہیں جن کی شخصیت نہ صرف یہ کہ ہر نوع کے کبر و غرور سے پاک ہوتی ہے بلکہ ان کی چال ڈھال سے سنجیدگی و متانت اور انکساری و تواضع جھلکتی ہے' کہ درخت پر جب پھل آتا ہے تو اس کی شاخیں جھک جایا کرتی ہیں)۔

اور جب جاہل ان کے منہ کو آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام O

(کہ عبادالرحمٰن کی شخصیت کی پختگی ہی کا یہ مظہر ہے کہ ناسمجھ اور مشتعل مزاج لوگ جب ان سے بحث و تکرار کرتے ہیں تو وہ گفتگو میں الجھنے اور کج بحثی میں وقت ضائع کرنے کی بجائے بڑی خوش اسلوبی سے' سلام کہتے ہوئے دامن بچا کر الگ ہو جاتے ہیں)

اور جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام کی حالت میں رات گزارتے ہیں O

(کہ پنج وقتہ فرض نماز کی ادائیگی کا اہتمام تو ہر بندۂ مومن پورے شدومد سے کرتا ہی ہے' رحمٰن کے محبوب بندوں کا معاملہ اس سے سوا ہے۔ وہ راتوں کو بے خبری کی نیند نہیں سوتے کہ رات کو سوئیں تو صبح کی خبر لائیں۔ اپنے رب' اپنے مطلوب و مقصود کے حضور مناجات کا شوق انہیں راتوں کو بے قرار رکھتا ہے' چنانچہ ان کی راتیں اپنے پروردگار کے حضور سجدہ و قیام کی حالت میں گزرتی ہیں)

اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب جہنم کے عذاب کو ہم سے دور کر دے' بے شک اس کا عذاب چمٹ جانے والا ہے O یقیناً وہ بہت بری جگہ ہے عارضی قیام گاہ کے طور پر بھی اور مستقل جائے قیام کے اعتبار سے بھی O

(عبدیت کے اس بلند مقام اور ایمان و ایقان کے اس عالی درجے پر فائز ہونے کے باوجود وہ اپنے رب کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بے خوف نہیں ہو جاتے۔ بلکہ اپنے پروردگار کی رحمتوں اور اس کی عنایات کی آس لگانے کے ساتھ ساتھ اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں ان کی کوئی لغزش پروردگار کی ناراضگی کا باعث بن جائے' دست بدعا رہتے ہیں کہ پروردگار ہمیں عذاب جہنم سے اپنی پناہ میں رکھنا کہ جہنم اتنی بھیانک جگہ ہے کہ وہاں مستقل قیام تو سراسر گھاٹے کا سودا ہے ہی' ایک لحظے کا وہاں قیام بھی یقیناً انتہائی ناگوار اور ناقابل برداشت ہو گا)

(سورۃ الفرقان' آیت نمبر ٦٣ تا ٦٦)

جوامع الکلم

نماز نور ہے اور صدقہ برہان ہے

(کہ انسان کو باطنی و روحانی سکون و اطمینان تو اللہ کے ذکر اور اس کی یاد ہی سے حاصل ہوتا ہے اور اللہ کی یاد کو دل میں بسانے کا سب سے موثر ذریعہ نماز ہے' تو نماز در حقیقت وہ نور ہے جو اس دنیا میں انسان کے باطن کو منور رکھتا اور روحانی سرور عطا کرتا ہے۔ آخرت میں یہی نور ایک مجسم حقیقت بن کر ظاہر ہو گا اور میدان حشر کے کٹھن مراحل میں بندۂ مومن کے لئے رہنما ثابت ہو گا۔ اور صدقہ جو اس دنیا میں بندۂ مومن کے ایمان کی علامت ہے' آخرت میں بندے کے حق میں دلیل بن جائے)

(صحیح مسلم بروایت ابو مالک الحارث بن عاصم اشعریؓ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

بانی مدیر: اقتدار احمد مرحوم

جلد ۵ شمارہ ۲۴

۴۴/ جون ۹۶ء

13

ایڈیٹر

حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات

تحریک خلافت پاکستان

۴ - اے، مزنگ روڈ، لاہور

مقام اشاعت

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: ۳-۵۸۶۹۵۰۱

پبلشر: محمد سعید اسعد طابع: رشید احمد چودھری

مطبع: مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ لاہور

قیمت فی پرچہ: ۸ روپے

سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) ۱۵۰ روپے

زرتعاون برائے بیرون پاکستان

☆ ترکی، اومان، مصر ۱۴۰/ امریکی ڈالر

☆ سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان ۲۰ امریکی ڈالر

☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ ۲۶ امریکی ڈالر

ایڈیٹر کے ڈیسک سے!

مسلمانانِ ہند کو انگریز اور ہندو کی دہری غلامی سے نجات قیامِ پاکستان کی صورت میں ملی تو پاکستان کو ایک مثالی اسلامی ریاست کی شکل میں ڈھالنے کی دہری ذمہ داری ہم پر لاگو ہو گئی' ایک تو اس اعتبار سے کہ حکومت الہیہ کا قیام یا دوسرے لفظوں میں نظامِ خلافت کے قیام کے لئے سعی و جہد کرنا ہر مسلمان کا فرضِ منصبی ہے اور دوسرے اس پہلو سے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران ہم نے نہایت بلند آہنگ کے ساتھ مل جل کر یہ نعرہ لگایا تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ۔ گویا پاکستان کو ایک مثالی اسلامی ریاست بنانے کا ایک اضافی عہد بھی ہم نے اپنے رب سے کیا تھا۔ اس دہری ذمہ داری کو ادا نہ کرنے کی پاداش میں ہم پھر اک دہری غلامی میں دھر لئے گئے۔ مکافاتِ عمل اسی کا نام ہے۔

یہ دہری غلامی ہے آئی ایم ایف اور دیسی لٹیروں کی جو ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن کر ہمارے سروں پر مسلط ہیں۔ انگریز کے دورِ حکومت میں بھی "چھترول" کا کام دیسی کارندوں سے ہی لیا جاتا تھا۔ اب عوام کی چمڑی ادھیڑنے اور ان پر قافیہ حیات تنگ کر کے انہیں ڈھور ڈنگر بنانے کا کام ہماری حکومتیں سرانجام دیتی ہیں۔ جس کی ایک نمایاں مثال فلسطین میں یاسر عرفات کی "حکومت" ہے' تاہم وہ تمام اسلامی حکومتیں جو نیو ورلڈ آرڈر کے سامنے سرنگوں ہیں' کم و بیش یہی "فرضِ منصبی" ادا کر رہی ہیں۔

ہمارا وفاقی بجٹ' جو آج کل زبان زدِ خاص و عام ہے' اسی تکلیف دہ صورتحال کا آئینہ دار ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کی طرف امیر تنظیم اسلامی نے اپنے گزشتہ خطاب کے ابتدائی حصے میں وفاقی بجٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اعداد و شمار کے گورکھ دھندے سے قطع نظر کہ جس کے اسرار و رموز سے صرف جدید ماہرین اقتصادیات ہی باخبر ہو سکتے ہیں' سچی بات یہ ہے کہ ہم بحیثیت قوم آئی ایم ایف کے توسط سے نیو ورلڈ آرڈر کی اسامی بن چکے ہیں۔ ورلڈ بینک یا آئی ایم ایف کا ادارہ ہمارے لئے ایک بہت بڑے ساہوکار کا درجہ رکھتا ہے جس سے مزید قرض حاصل کرنے کے لئے کہ جس کا ایک بڑا حصہ حکمران طبقے کی عیاشیوں اور اللوں تللوں پر خرچ ہو گا' ہم اس کی تمام شرائط کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہیں۔ نیو ورلڈ آرڈر جس کی پشت پر یہودی ذہن کام کر رہا ہے' پوری دنیا کو اپنے معاشی چنگل میں گرفتار کر کے دنیا کے تمام پیداواری وسائل اور دولت پر اپنا کنٹرول چاہتا ہے۔ جس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہو چکا ہے۔ ان کے مکروہ عزائم کا اصل الاصول یہ ہے کہ یہود کے سوا بقیہ تمام نوعِ انسانی دراصل شرفِ انسانیت سے محروم ہے' چنانچہ ان کا ہر طرح سے استحصال کرنا اور انہیں ڈھور ڈنگروں کی طرح اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا یہود کا جائز حق ہے۔ ان کی پالیسی یہ ہے کہ سودی معیشت کے جال میں پھنسا کر اور آسائشوں اور رنگینیوں کے دام میں گرفتار کر کے پوری نوعِ انسانی کو حیوان بنا کر رکھ دیا جائے کہ وہ اپنی دو وقت کی روٹی اور نظر کو خیرہ کرنے والی مادی سہولیات کے حصول کے لئے دیگر تمام چیزوں کو بھلا کر جن میں اللہ اور تصورِ آخرت بھی شامل ہے' محض روپے پیسے کمانے میں لگ جائیں۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے ان پر اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی دھن سوار کر دی جائے اور مختلف قسم کے ٹیکسوں کی بھرمار کے ذریعے ان پر قافیہ حیات اس درجے تنگ کر دیا جائے کہ ایک غمِ روزگار کے سوا دوسرے تمام غموں کو فراموش کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہ رہے۔ اپنی زندگی کے بنیادی لوازمات کی فراہمی بھی ان کے لئے اس قدر مشکل بنا دی جائے کہ وہ اپنی عورتوں کو بھی گھروں سے نکال کر دفتروں میں بھیجنے پر مجبور ہو جائیں۔ عورتوں کا گھر کی چار دیواری سے نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا نیو ورلڈ آرڈر کے مکروہ عزائم کی تکمیل میں ایک موثر عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح پوری نوعِ انسانی کو لہو کے بیل کی طرح محنت کرنے پر مجبور ہو گی اور اس محنت کی ساری کمائی وہ خود کھائیں گے۔ ان محنت کرنے والوں کو اس کمائی کا صرف اتنا حصہ ملے گا جو ان کی حیات کے تسلسل کے لئے ناگزیر ہو گا' ہاں انسانوں میں وہ "پالتو اور وفادار لوگ" جو ان کے اس گھناؤنے نظام کی تنفیذ میں ان کے معاون و مددگار اور آلہ کار بنیں گے' ان پر نوازشات کی بارش ہو گی۔ ترقی و خوشحالی کے تمام دروازے ان کے لئے وا کر دیئے جائیں گے۔ یہی دجالی فتنہ ہے جو اب ہم پر مسلط ہو چکا ہے۔ ہم درجہ بدرجہ اسی رخ پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ نیو ورلڈ آرڈر کی معاشی گرفت ہم پر روز بروز تنگ ہو رہی ہے۔ ہمارا قومی بجٹ اس امر کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے۔○○

اقبال' آزاد ہندوستان میں "دارالاسلام" کو اپنا مقصود حقیقی بنائے ہوئے تھے

آخری دور میں اقبال نے تمام کتابوں کو الگ کر دیا تھا سوائے قرآن کے

ان کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے

مولانا مودودی کی ایک اہم تحریر جو ۲۱ اپریل ۱۹۹۴ء کے نوائے وقت میں شائع ہوئی

دنیا کا میلان ابتداء سے جدید ترین دور تک اکابر پرستی کی جانب رہا ہے ہر بڑی چیز کو دیکھ کر "پداربی' ہذا اکبر" کہنے کی عادت جس کا ظہور قدیم ترین انسان سے ہوا تھا آج تک اس سے نہیں چھوٹی ہے۔ جس طرح دو ہزار برس پہلے بدھ کی عظمت کا اعتراف اس مخلوق کے نزدیک بجز اس کے اور کسی صورت سے نہ ہو سکتا تھا کہ اس کا مجسمہ بنا کر اس کی عبادت کی جائے' اسی طرح آج ۲۰ ویں صدی میں دنیا کی سب سے زیادہ سخت منکر عبدیت قوم (روس) کا ذہن لینن کی بزرگی کے اعتراف کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں سوچ سکتا کہ اس کی شخصیت کے آگے مراسم عبودیت بجالائیں۔

لیکن مسلمانوں کا نقطہ نظر اس باب میں عام انسانوں سے مختلف ہے۔ اکابر پرستی کا تصور اس کے ذہن کی افتاد سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ وہ بڑوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کی صرف ایک ہی صورت سوچ سکتا ہے یعنی "اللہ نے ان کو زندگی کا سیدھا راستہ بتایا تھا' جس پر چل کر وہ بزرگی کے مراتب تک پہنچے' لہٰذا ان کی زندگی سے سبق حاصل کرو اور اس کے مطابق عمل کرو"۔

سب جانتے ہیں کہ اقبال" نے یہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے نوجوان انگریزی یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یہی تاریخ' یہی ادب' یہی اقتصادیات' یہی سیاسیات' یہی قانون اور یہی فلسفہ انہوں نے پڑھا تھا اور ان فنون میں بھی وہ مبتدی نہ تھے بلکہ منتہی فارغ التحصیل تھے۔ خصوصاً فلسفہ میں تو ان کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا جس کا اعتراف موجودہ دور کے اکابر فلاسفر تک کر چکے ہیں۔ جس شراب کے دو چار گھونٹ پی کر بہت سے لوگ بہکنے لگتے ہیں یہ مرحوم اس کے سمندر پیئے بیٹھا تھا۔ پھر مغرب اور اس کی تہذیب کو بھی اس نے محض ساحل پر سے نہیں دیکھا تھا۔ جس طرح ہمارے ۹۹ فیصدی نوجوان دیکھتے ہیں بلکہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کر تہہ تک اتر چکا تھا اور ان سب مرحلوں سے گزرا تھا جن میں پہنچ کر ہماری قوم کے ہزاروں نوجوان اپنے دین و ایمان' اپنے اصول' تہذیب و تمدن اور اپنے قومی اخلاق کے مبادی تک سے برگشتہ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اپنی قومی زبان بولنے کے قابل نہیں رہتے۔

لیکن اس کے باوجود اس شخص کا حال کیا تھا؟ مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا' اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن کریم میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی ہی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا' قرآن کریم کے دماغ سے سوچتا تھا جو کچھ دیکھتا تھا' قرآن کریم کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شے واحد تھے اور اس شے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس کے دور کے علماء دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو فنائیت فی القرآن میں اس امام فلسفہ اور اس ایم اے پی ایچ ڈی بار ایٹ لاء سے لگا کھاتا ہو۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آخری دور میں اقبال" نے تمام کتابوں کو الگ کر دیا تھا اور سوائے قرآن کے اور کوئی کتاب وہ اپنے سامنے نہ رکھتے تھے۔ سالہا سال تک علوم و فنون کے دفتروں میں غرق رہنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے تھے' وہ یہ تھا کہ اصل علم قرآن ہے اور یہ جس کے ہاتھ آجائے' وہ دنیا کی تمام کتابوں سے بے نیاز ہے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ان کے پاس فلسفہ کے چند اہم سوالات بھیجے اور ان کا جواب مانگا۔ ان کے قریب رہنے والے لوگ متوقع تھے کہ اب علامہ اپنی لائبریری کی الماریاں کھلوائیں گے اور بڑی بڑی کتابوں کو نکلوا کر ان مسائل کا حل تلاش کریں گے' مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لائبریری کی الماریاں مقفل رہیں اور وہ صرف قرآن پاک ہاتھ میں لے کر جواب لکھنے بیٹھ گئے۔

"رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے' مگر یہ شاید کسی کو نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسول عربی ﷺ کے قدموں میں ایک متاع حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا۔ حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں اور پہلو بدل بدل کر تاویلیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا اور ایسی کوئی حدیث سن کر ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اصحاب ثلاثہ کے ساتھ کوہ احد پر تشریف رکھتے تھے۔ اتنے میں احد لرزنے لگا اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ "ٹھہر جا' تیرے اوپر ایک نبی ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے اس پر پہاڑ ساکن ہو گیا"۔

اقبال" نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے؟ میں اس کو استعارہ و مجاز نہیں' بالکل ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں' اور میرے

نزدیک اس کے لئے کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک نبیؐ کے نیچے آکر مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اٹھتے ہیں' مجازی طور پر نہیں' واقعی لرز اٹھتے ہیں"۔

اسلامی شریعت کے جن احکام کو بہت سے روشن خیال حضرات فرسودہ اور بوسیدہ قوانین سمجھتے ہیں اور جن پر اعتقاد رکھنا ان کے نزدیک ایسی تاریک خیالی ہے کہ مہذب سوسائٹی میں ان کی تائید کرنا ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لئے ڈوب مرنے سے زیادہ بدتر ہے۔ اقبالؒ نہ صرف ان کو مانتا اور ان پر عمل کرتا تھا بلکہ برملا ان کی حمایت کرتا تھا اور اس کو کسی کے سامنے ان کی تائید کرنے میں باک نہ تھا۔ ان کی ایک معمولی مثال سن لیجئے۔ ایک مرتبہ حکومت ہند نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا اور یہ عہدہ ان کے سامنے باقاعدہ پیش کیا' مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ نہ کرائیں گے اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبال کو ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے۔ اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور خود لارڈ ولنگڈن کو کہا کہ میں بیشک ایک گناہ گار آدمی ہوں' احکام اسلامی کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوتی ہیں' مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا عہدہ حاصل کرنے کے لئے شریعت کے حکم کو توڑ دوں۔

اقبالؒ کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے عمل سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا۔ اس بدگمانی کے پیدا کرنے میں خود ان کی افتاد طبیعت کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ ان میں کچھ فرقہ ملامتیہ کے سے میلانات تھے جن کی بناء پر اپنی رندی کے اشتہار دینے میں انہیں کچھ مزا آتا تھا ورنہ درحقیقت وہ اتنے بے عمل نہ تھے۔

قرآن مجید کی تلاوت سے ان کو خاص شغف تھا اور صبح کے وقت بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے' اخیر زمانے میں طبیعت کی رقت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ تلاوت کے دوران روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں اور مسلسل پڑھ ہی نہ سکتے تھے۔ نماز بھی بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے' مگر چھپ کر' ظاہر میں یہی اعلان تھا "گو تر اگفتار کا غازی ہوں"۔

ان کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے حالات ان کی وفات ہی کے بعد لوگوں میں شائع ہوئے۔ ورنہ عام خیال یہی تھا کہ جیسے اور "سرصاحبان" ہوتے ہیں ویسے ہی وہ بھی ہوں گے اور اسی بناء پر بہت سے لوگوں نے یہاں تک بلا تحقیق لکھ ڈالا تھا کہ ان کی بارگاہ عالی تک رسائی کہاں ہوتی ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ شخص حقیقت میں اس سے بھی زیادہ فقیر منش تھا' جتنا اس کی وفات کے بعد لوگوں نے اخبارات میں بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ سن لیجئے' جس سے اس نائٹ اور بیرسٹر کی طبیعت کا آپ اندازہ کر سکیں گے پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لئے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون دان اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبالؒ اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لئے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاک ﷺ کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں' اس نے بوریے پر سو سو کر زندگی گزاری۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اٹھے اور برابر کے غسل خانہ میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اس غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے' غسل خانہ ہی میں سوتے رہے۔ یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے۔ جب باہر کی دنیا ان کو سوٹ بوٹ میں دیکھا کرتی تھی کسی کو خبر نہ تھی کہ اس سوٹ بوٹ کے اندر جو شخص چھپا ہوا ہے اس کی اصلی شخصیت کیا ہے؟ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا کہ جو سیاسی اغراض کے لئے سادگی و فقر کا اشتہار دیتے ہیں اور سوشلسٹ بن کر غریبوں کی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں' مگر پبلک کی نگاہوں سے ہٹ کر ان کی تمام زندگی رئیسانہ اور عیش پسندانہ ہے۔

اقبالؒ کے نائٹ ہڈ اور سر شفیع مرحوم جیسے حضرات کے ساتھ ان کے سیاسی رشتہ کو دیکھ کر عام خیال یہ تھا اور اب بھی ہے کہ وہ محض شاعری ہی میں آزاد تھے عملی زندگی میں آزاد خیالی ان کو چھو کر بھی نہ گزری تھی' بلکہ وہ نرے انگریز کے غلام تھے' لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے قریب جو جو لوگ رہے ہیں اور جن کو گہرے ربط و ضبط کی بناء پر ان کی اندرونی زندگی اور ان کے اندرونی خیالات کا علم ہے' وہ جانتے ہیں کہ انگریزی سیاست سے ان کو خیال اور عمل دونوں میں سخت نفرت تھی۔ بارگاہ حکومت سے وہ کوسوں دور بھاگتے تھے۔ سرکار اور اس کے پرستار دونوں ان سے سخت بدگمان تھے اور ان کی ذات کو اپنے مقاصد میں حارج سمجھتے تھے۔

سیاسیات میں ان کا نصب العین محض کامل آزادی ہی نہ تھا بلکہ وہ آزاد ہندوستان میں "دارالسلام" کو اپنا مقصود حقیقی بنائے ہوئے تھے۔ اس لئے کسی ایسی تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھے جو ایک دارالکفر کو دوسرے دارالکفر میں تبدیل کرنے والی ہو۔

صرف یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عملی سیاسیات میں ان لوگوں کے ساتھ مجبورانہ تعاون کیا جو برٹش گورنمنٹ کے زیر سایہ ہندو راج کے قیام کی مخالفت کر رہے تھے۔ گو مقاصد کے اعتبار سے ان میں اور اس طبقہ میں کوئی ربط نہ تھا' مگر صرف اس مصلحت نے ان کو اس طبقہ کے ساتھ جوڑ رکھا تھا کہ جب تک مسلمان نوجوانوں میں "دارالسلام" کا نصب العین ایک آتش فروزاں کی طرح بھڑک نہ اٹھے اور وہ اس کے لئے سرفروشانہ جدوجہد پر آمادہ نہ ہوں' اس وقت تک کم از کم انقلاب کے رخ کو بالکل دوسری جانب پلٹ جانے سے روکے رکھا جائے۔ اس بناء پر انہوں نے ایک طرف اپنی شاعری سے نوجوانان اسلام کے دلوں میں وہ روح پھونکنے کی کوشش کی جس سے سب لوگ واقف ہیں اور دوسری طرف عملی سیاسیات میں وہ روش اختیار کی جس کے اصل مقصود سے چند خاص آدمیوں کے سوا کوئی واقف نہیں اور جس کے بعض ظاہری پہلوؤں کی وجہ سے وہ خود اپنے بہترین عقیدت مند معترفین تک کے طعنے سنتے رہے۔OO

ضرورت رشتہ

فوج میں کیپٹن ڈینٹری ڈاکٹر کے لئے جس کی عمر ۳۳ سال ہے' پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور اس سے دو بچے (عمر ۲ سال' ۴ سال) ہیں' دینی گھرانے سے تعلق رکھنے والی اچھی سیرت و صورت کی حامل' پڑھی لکھی خاتون (دوشیزہ' مطلقہ' بیوہ) کا رشتہ درکار ہے۔ ذات' پات کی کوئی قید نہیں۔ تنظیم اسلامی میں شامل خاتون کو ترجیح دی جائے گی۔

رابطہ : میاں تجمل واحد' بھگوان سٹریٹ
پرانی انارکلی لاہور فون : 7324919-7351601

اگر پاکستانی قومیت جائز ہے تو بنگالی یا سندھی قومیت کیوں جائز نہیں؟

عالم اسلام پر اپنا تسلط قائم رکھنے کیلئے برطانیہ اور امریکہ کے نزدیک سعودی عرب کی مرکزی اہمیت تھی

پاکستان کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ حقیقی اسلام کی جانب پیش رفت کے نتیجے میں امریکہ سے اس کے تعلقات خراب ہوتے

محمد علی بوگرہ کو واشنگٹن سے ظفر اللہ کی مخالفت کرنے والے "مذہبی جنونیوں" سے نپٹنے کے لئے بھیجا گیا تھا

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان تحریر : عمران ابن حسین

خلافت کے خاتمے سے جو خلاء پیدا ہو گیا تھا اسے پر کرنے اور مسلمانان عالم کو دوبارہ اتحاد اور یک جہتی کی راہ پر ڈالنے کے لئے جنگ عظیم دوم کے بعد جو پہلی کوشش ہوئی اس کی سعادت نوزائیدہ اسلامی مملکت' پاکستان کے حصے میں آئی۔ ۱۹۲۶ء میں منعقد ہونے والی پہلی ورلڈ مسلم کانگریس کے ۲۳ سال بعد پہلی مرتبہ فروری ۱۹۴۹ء میں پاکستان میں زندہ کیا گیا۔

چنانچہ کراچی میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی اور پاکستان کے پہلے اور آخری شیخ الاسلام' مولانا شبیر احمد عثمانی کو اس کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ کانفرنس میں پاکستان' عراق' مصر' ایران' ترکی' افغانستان' دی مغرب (شمالی افریقہ)' سعودی عرب' لبنان' جزائر مالدیپ' سپینی مراکو' جنوبی افریقہ کے ایک صوبے (ٹرانس وال) اور عرب لیگ کے نمائندوں نے شرکت کی۔

کانگریس کے احیاء کے علاوہ اس کانفرنس کی نمایاں خصوصیت پاکستان کا اس میں اہم کردار تھا۔ پاکستان کے پیش نظر بظاہر مسلمانوں کے بین الاقوامی اتحاد کے ذریعے بھارتی خطرے کے خلاف اپنی سلامتی کا دفاع کرنا تھا۔ انتہائی غیر یقینی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے پاکستان نے اسلام کو اپنی خارجہ پالیسی میں ایک اہم عنصر کے طور پر استعمال کیا۔ بابائے قوم محمد علی جناح چند ماہ قبل ستمبر ۱۹۴۸ء میں انتقال کر گئے تھے جس کی وجہ سے پاکستان کو یہ خطرہ تھا کہ بھارت اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ کانفرنس کا فوری فائدہ یہ ہوا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جاری کشمیر میں جنگ بند ہو گئی۔

یہاں یہ بھی بتا دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ پاکستان نے اپنی سلامتی کے تحفظ کے لئے سہی' مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے کا عمل شروع کر کے اسے ایک حد تک تقویت تو فراہم کر دی لیکن ساتھ ہی خود امریکہ کی جھولی میں جا گرا۔ پاکستان کی یہ دو رخی بعد میں اس کی خارجہ پالیسی میں مستقل شکل اختیار کر گئی۔

پاکستان کے اس اقدام کے کئی دیگر اہم مضمرات بھی تھے۔ پاکستان اس نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں جسے "مسلم قومیت" کا نام دیا گیا تھا لیکن جب پاکستان بن گیا تو پاکستانی مسلمان پھر بھی اپنے آپ کو ایک الگ قوم سمجھتے رہے اور باقی دنیا کے مسلمانوں سے الگ ایک قوم بنے رہے۔ اسے "پاکستانی مسلمان قوم" کا نام دیا گیا۔ جب دنیا کے مسلمان مختلف قوموں میں بٹ کر پاکستانی' مصری' ایرانی' سعودی وغیرہ بن گئے تو اسلامی یک جہتی کی نوعیت بھی بدل کر "بین الاقوامی" کی ہو گئی چنانچہ ورلڈ مسلم کانگریس کی حیثیت ایک بین الاقوامی ادارے کی ہی ہو سکتی تھی جس کا کام مسلمان "قوموں" کی نمائندگی ہوتا لہٰذا ۱۹۲۶ء میں کانگریس سے جو کام ابن سعود لینا چاہتے تھے' وہ بالکل اسی نہج پر پہنچ گئی تھی۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس نے اپنے طرز عمل سے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار لی۔ اس لئے کہ اگر پاکستانی قومیت جائز ہو سکتی تھی تو بنگالی یا سندھی قومیت بھی جائز تھی۔ کیونکہ پاکستان میں مختلف نسلوں اور قبیلوں کے لوگ آباد تھے۔ لہٰذا اب مجبوراً اسے سیکولرزم کا سہارا لینا پڑا اور یہ کہا گیا کہ تمام پاکستانی بلالحاظ مذہب و عقیدہ ایک قوم ہیں اور یہ کہ جناح خود بھی وفات سے قبل اسی "سیکولر پاکستانی قومیت" کے حق میں تھے۔

بہرحال جناح کے بعد نئی قیادت کو جب بھارتی خطرات کا سامنا ہوا تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ملک کے تحفظ کی خاطر "بین الاقوامی اتحاد اسلامی" کا سہارا لیا جائے جس کے لئے سیکولر پاکستانی قومیت کی بجائے "مسلم پاکستانی قومیت" کا نعرہ بلند کرنا ضروری تھا۔ البتہ جہاں تک اتحاد مسلمین کے لئے خلافت کے احیاء کا تعلق تھا تو ابن سعود کی پیروی میں ورلڈ مسلم کانگریس میں نئے سرے سے جان ڈالنے کی کوشش کر کے پاکستان نے ثابت کر دیا کہ اس کے نزدیک خلافت کے احیاء کی کوئی اہمیت نہیں اور نہ ہی اسے دارالاسلام سے دلچسپی ہے' بلکہ ترکی اور اہل سعود کی طرح کی ایک جدید مسلمان ریاست قائم کرنا مطلوب ہے۔ دارالاسلام کے قیام کے لئے عالم اسلام کے سامنے جو مشکلات اور رکاوٹیں درپیش تھیں ان سے قطع نظر پاکستان کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ حقیقی اسلام کی جانب پیش رفت کے نتیجے میں امریکہ سے اس کے تعلقات خراب ہوتے جبکہ اس کی سلامتی کا سارا دارومدار امریکہ پر تھا۔

اس کے علاوہ اگر پاکستان کو دارالاسلام کی حیثیت حاصل ہو جاتی تو اس سے سعودی حکومت فوری طور پر عدم استحکام سے دوچار ہو جاتی جبکہ عالم اسلام پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے برطانیہ اور امریکہ کے نزدیک سعودی عرب کی مرکزی اہمیت تھی۔

حکومت پاکستان نے جس تندہی سے کانفرنس کا اہتمام کیا تھا اور اس میں اسے طبقہ علماء اور عوام کا بھرپور تعاون حاصل رہا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک کسی کے ذہن میں سرکاری' غیر سرکاری کا مسئلہ موجود نہیں تھا لیکن ظاہر بات ہے کہ حکومت کانگریس کو ایک سرکاری ادارہ ہی سمجھ

رہی تھی اور اس کے نزدیک اپنے مقاصد کے حصول میں اسے بطور زینہ استعمال کرنے کے لئے غیر سرکاری طبقات پر سبقت حاصل کرنا غیر ضروری تھا۔

انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس

اسی سال کے اندر اندر ایک اور بین الاقوامی اسلامی کانفرنس بھی منعقد ہو گئی۔ اس کا انعقاد بھی کراچی میں ہوا۔ اگرچہ اس کانفرنس کا اہتمام شہر کے کاروباری حلقوں نے کیا تھا مگر دسمبر ۱۹۴۹ء میں اس کا انعقاد بھی حکومت پاکستان کی سربراہی میں ہی ہوا۔ جناح نے اپنی وفات سے قبل خود بھی ایسی ایک کانفرنس منعقد کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی جس کا تعلق مسلمانوں کی معاشی زندگی سے ہو' چنانچہ انہوں نے یہ کام اپنے وزیر مال غلام محمد کے سپرد کیا تھا اور انہی کی کوشش سے یہ کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔

وزیراعظم لیاقت علی خان نے اپنے افتتاحی خطاب میں بڑی تفصیل سے مسلمانوں کو درپیش سیاسی اور معاشی مسائل کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کے پاس کسی شے کی کمی نہیں ہے۔ اللہ نے انہیں قدرتی وسائل سے مالا مال خطے عطا کئے ہیں اور فوجی لحاظ سے بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ انہیں مغربی جمہوریت یا کمیونزم کی طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے ان کے پاس اللہ کا دیا ہوا اپنا ایک بہترین نظام موجود ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم بڑی طاقتوں کے دباؤ سے باہر آئیں اور آپس میں تعاون کے ذریعے معاشی روابط قائم کریں۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ بینکنگ' جہاز رانی اور انشورنس جیسے شعبوں میں تعاون کا فوری طور پر آغاز کیا جا سکتا ہے۔

کانفرنس نے کراچی کو اپنا صدر مقام بنانے کا فیصلہ کیا جس کے لئے وہاں ایک سیکرٹریٹ قائم کرنے کی تجویز منظور کی گئی۔ اس کے علاوہ کئی اہم شعبوں میں' جن میں زراعت کا شعبہ سرفہرست تھا' تعاون بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ یہ کانفرنس ہر سال ہوا کرے گی۔

چنانچہ اگلی کانفرنس پروگرام کے مطابق اکتوبر ۱۹۵۰ء میں تہران میں ہوئی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ معاشی میدان میں باہمی تعاون کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے کے عمل کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ پاکستان نے اس کانفرنس میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ پاکستان کے وزیر مال غلام محمد نے ۳/ اکتوبر کو اپنے خطاب سے کانفرنس کا افتتاح کیا اور بعد میں ہونے والی کارروائی میں بھی پاکستان نے مرکزی کردار ادا کیا۔

ایران کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات کے پیش نظر عرب حکومتوں کی اس کانفرنس میں شرکت غیر یقینی تھی لیکن عرب لیگ کے نمائندوں نے اسکندریہ میں اپنے اجلاس میں ایران کی یہ وضاحت قبول کر لی کہ اس نے اسرائیل کا صرف وجود تسلیم کیا ہے اس کے ساتھ تجارتی لین دین یا قرضوں کے بارے میں اس کے کوئی مذاکرات نہیں کئے۔

اس کانفرنس میں مندرجہ ذیل ممالک سے نمائندے شرکت کے لئے آئے۔ افغانستان' مصر' انڈونیشیا (جو ۱۹۴۹ء کی کانفرنس میں غیر حاضر رہا تھا) ایران' عراق' اردن' لبنان' پاکستان' سعودی عرب' شام اور ترکی۔ اس کے علاوہ بھارت اور لنکا کی مسلمان اقلیتوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ کانفرنس نے مختلف امور کا جائزہ لینے کے لئے دس کمیٹیاں قائم کیں۔ پاکستان کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان دس میں سے پانچ کمیٹیوں کے چیرمین پاکستانی تھے۔

کانفرنس نے جو فیصلے کئے ان میں یہ فیصلے خاص طور پر قابل ذکر ہیں (اور ان فیصلوں کی صدائے بازگشت ان قراردادوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ جو ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں کے وسط میں منعقد ہونے والی وزرائے خارجہ کی سطح کی اسلامی کانفرنسوں میں منظور کی گئیں)

- ماہرین کے ایسے مستقل گروپ قائم کئے جائیں جو تھوڑے تھوڑے وقفوں سے اپنے اجلاسوں میں مختلف مسلم ممالک کے درمیان مالی تعاون کا جائزہ لیتے رہیں۔
- بنکاری سے متعلق شرائط طے کرنے میں ایک دوسرے سے تعاون کیا جائے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں رقوم کی منتقلی میں سہولتیں پیدا کی جائیں۔
- بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے ساتھ روابط میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ مسلمان ممالک سے متعلق مالی معلومات اور اعداد و شمار کی فراہمی اور باہمی مبادلہ۔ وغیرہ

مزید برآں کانفرنس نے مسلمان ممالک کی حکومتوں سے سفارش کی کہ کسی مسلمان ملک سے آنے والے افراد کو اپنے ہاں ملازمت دینے میں ترجیح دیں۔ ایک اسلامی لیبر فیڈریشن کے قیام میں تعاون کریں اور مالکوں اور ان کے ملازموں کی امداد باہمی کی سوسائٹیاں بنانے کی حوصلہ افزائی کریں۔

ان اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانفرنس نے مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے میں عملی پیش رفت کا اہتمام کر دیا تھا اور درحقیقت یہی وہ سب سے اہم اور قابل ذکر کامیابی تھی جو اس کانفرنس کے ذریعے حاصل ہوئی تھی۔ اس سے یہ امکان بھی نظر آنے لگا تھا کہ اگر سیاسی اختلافات سے ہٹ کر صرف معاشی سطح پر تعاون کو فروغ دیا جائے تو مسلمانان عالم کے باہمی اتحاد کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ اسلامی معاشیاتی کانفرنس نے نئی قائم ہونے والی اسلامی مملکت پاکستان کی ولولہ انگیز اور پرجوش ابتداء میں بہت خوش کن کارکردگی دکھائی لیکن حسب معمول تہران کانفرنس کے بعد اگلے سالانہ اجلاس کے منعقد ہونے کی نوبت نہ آ سکی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بین الاقوامی اسلامی اتحاد قائم کرنا آسان کام نہیں۔ پاکستان عالم اسلامی کی یک جہتی کے لئے جو کردار ادا کرنے کا خواہاں تھا اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود اس کے اپنے بین الاقوامی سیاسی تعلقات تھے چہ جائیکہ عالم اسلام کے اندرونی اختلافات اور تضادات دور کرانے کی کوئی سعی و جہد کی جاتی۔

ورلڈ مسلم کانگرس

فروری ۱۹۵۱ء میں ورلڈ مسلم کانگریس کا ایک اور اجلاس پاکستان میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس ۱۹۴۹ء کے اجلاس کے مقابلے میں زیادہ کامیاب تھا کیونکہ اس میں کئی اور مسلم ممالک سے بھی نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اس کا افتتاح بھی وزیراعظم لیاقت علی خان نے کیا (جنہیں چند ہی ماہ بعد قتل کر دیا گیا) اسلام کی جانب پیش رفت میں پاکستان کو جو اہمیت حاصل ہو گئی تھی یہ کانفرنس اس کی اعلیٰ مظہر تھی۔ حبیب بورقیہ (تیونس کے آئندہ ہونے والے صدر) اور حسن عبداللہ عثمان (صومالیہ کے اگلے صدر) دونوں اس کانفرنس میں شریک تھے۔

کانفرنس میں مشرق وسطیٰ اور مسلمانوں کی آزادی کی تحریکوں' خصوصاً شمالی افریقہ میں جاری تحریکوں کے حق میں قرار دادیں منظور کی گئیں۔ کانفرنس نے بھارت کے ساتھ کشمیر کے تنازعے میں پاکستان کی حمایت کا اعلان بھی کیا' مگر کانفرنس کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس میں مسلم ممالک کے درمیان ایک مشترکہ دفاع کے معاہدے کا اعلان کیا گیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ کسی بھی مسلمان ملک کے خلاف ہونے والی جارحیت کو تمام مسلم ممالک کے

خلاف جارحیت تصور کیا جائے گا۔ کراچی میں ورلڈ مسلم کانگریس کا ایک چھوٹا سا سیکرٹریٹ بھی قائم کیا گیا جو اب تک کام کر رہا ہے۔

اس وقت یہ بات کھل کر سامنے آ چکی تھی کہ ورلڈ مسلم کانگریس کی حیثیت ایک بین الحکومتی ادارے کی ہوگی۔ پاکستان کو اس کی بدولت اپنے وقار کو مضبوط بنانے میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی مگر بعد میں یہی کامیابی اس کی سب سے بڑی کمزوری بن گئی کیونکہ اس سے بھارت کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ پاکستان اسلام کو غلط طور پر اپنے ملکی مفاد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ بھارت کا کہنا تھا کہ اس کا کسی دوسرے اسلامی ملک کے ساتھ کسی قسم کا جھگڑا نہیں اور مسلم اتحاد کے نام پر اس کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈا سے سوائے منفی اثرات پیدا کرنے کے کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ چنانچہ بھارت کی یہ حکمت عملی جلد ہی کامیاب ثابت ہوئی اور پاکستان کو الٹا لینے کے دینے پڑ گئے۔

اجتماع علمائے اسلام

شیخ الاسلام، شبیر احمد عثمانی مرحوم کا جن کا ۱۹۵۰ء میں انتقال ہوا تھا، ۱۶/ فروری ۱۹۵۲ء کو سالانہ عرس تھا۔ اس موقع پر عالم اسلام کے کئی ممتاز علماء کراچی میں جمع ہوئے اور ایک اسلامی کانفرنس میں شریک ہوئے جس کا اہتمام پاکستانی علماء کی ایک ایسوسی ایشن نے کیا تھا۔ مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی نے، جو اس کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے، عالم اسلام کی یک جہتی کے لئے ایک اسلامی بلاک قائم کرنے کی ضرورت پر دیا اور کہا کہ اسلام کی رو سے امت مسلمہ کے اتحاد کے لئے جدوجہد کرنا ہر مسلمان کا فرض منصبی ہے۔ اصولی طور پر ان کی یہ بات صد فیصد درست تھی، قرآن کی رو سے تمام مسلمان ایک قوم ہیں لیکن سوال تو یہ تھا کہ وہ امت بالفعل موجود بھی تھی؟ حال یہ تھا کہ مسلمان پاکستانی، مصری، ایرانی، سعودی وغیرہ قوموں میں بٹے ہوئے تھے۔ کانگریس کے شرکاء میں سے کسی ایک کی نظر بھی اس طرف نہ گئی۔

ورلڈ مسلم کانگریس

کراچی میں ۱۶ فروری کو عرس کے موقع پر جو علماء کانفرنس ہوئی تھی اس کے کچھ روز بعد ۱۴ سے ۱۷ مارچ ۱۹۵۲ء تک کراچی میں ہی ورلڈ مسلم کانگریس کی شوریٰ کا ایک اجلاس ہوا جس میں بارہ مسلم ممالک سے غیر سرکاری نمائندے شریک ہوئے۔ اجلاس میں مسلم ممالک کی ایک دولت مشترکہ قائم کرنے، اور تمام مسلمانوں کو اسلامی شہریت دینے کی سفارش کی گئی تاکہ ایک مسلمان کو کسی بھی اسلامی ملک میں آزادانہ آنے جانے کی سہولت حاصل ہو۔ اس کے علاوہ شمالی اور جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے حق میں نیز فلسطین میں مسلط کی گئی صیہونی ریاست کے خلاف قراردادیں منظور کی گئیں۔ کراچی میں کانگریس کا مستقل ہیڈ کوارٹر قائم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

عالم اسلام جس بین الاقوامی نظام کا حصہ بن رہا تھا اس کے تحت مسلمان ممالک کی دولت مشترکہ کا قیام تو شاید زیادہ قابل اعتراض بات نہ ہوتی لیکن "اسلامی شہریت" کی تجویز کا تو براہ راست دار الاسلام کے ساتھ جا کر تعلق جڑتا، گویا اس کا مطلب اسلام کا احیاء ہوتا۔ لیکن جس کونسل میں یہ تجویز منظور کی گئی تھی اس میں کوئی حکومتی نمائندہ شریک نہیں تھا لہٰذا اس کی حیثیت بالکل غیر سرکاری تھی۔

بین الاسلامی ریاستی مشاورتی کونسل

ورلڈ مسلم کانگریس کونسل کی مسلم ممالک کی دولت مشترکہ کی تجویز کے جواب میں حکومت پاکستان نے کراچی میں مسلم ممالک کی ایک کانفرنس بلانے کی کوششیں شروع کر دیں جس کا مقصد ایک بین الاسلامی ریاستی مشاورتی کونسل قائم کرانا تھا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ محمد ظفر اللہ خان نے مجوزہ مشاورتی کونسل کے مقاصد ان الفاظ میں بیان کئے:

"ایک سنٹرل اتھارٹی کے زیر سرکردگی اسلامی ممالک کا ایک ایسا بلاک جلد از جلد قائم کیا جائے جو مسلم ممالک کے درمیان تعاون کے لئے رابطے کا کام سرانجام دے"۔

مجوزہ بلاک کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے مزید بتایا کہ یہ بلاک مغربی سامراجی بلاک اور کمیونسٹ بلاک دونوں سے الگ اپنا کام کرے گا، گویا اس کی حیثیت "تیسری طاقت" کی ہوگی۔ ظفر اللہ خان دراصل اس سے اندرونی مخالفین اور بیرونی ناقدین کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ پاکستان کے وزیر اعظم، لیاقت علی خان (مرحوم) کے مشہور زمانہ دورۂ امریکہ کے بعد بھی دونوں بڑی طاقتوں کے حوالے سے پاکستان کی خارجہ پالیسی ناوابستگی پر مبنی ہے لیکن انہوں نے جو تجویز پیش کی تھی وہ درحقیقت ناوابستگی سے بھی ایک قدم آگے تھی، یعنی دو بڑی طاقتوں کے حلقہ اثر سے باہر ایک تیسری بڑی طاقت کا قیام، جس کی بنیادیں بین الاقوامی الاسلامی یکجہتی پر استوار ہوں۔

پاکستان کی تمام تر سفارتی کوششوں کے باوجود مذکورہ بالا کانفرنس منعقد نہ ہو سکی۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ عام تاثر یہ تھا کہ پاکستان کی عالم اسلام کو یکجا کرنے کی کوشش درحقیقت مغربی طاقتوں کے مفاد میں ہے۔ دوسرے یہ کہ پاکستان بھارت کے ساتھ اپنے کشیدہ تعلقات کی وجہ سے اپنا سیاسی مسئلہ حل کرنا چاہتا ہے اس لئے ظفر اللہ خان کی بات میں وہ وزن نہ تھا جو ہونا چاہئے تھا۔ ادھر نہرو نے یہ کہہ کر خبردار کر دیا تھا کہ مذہب کے نام پر علاقائی گروہ بندی کا نتیجہ امن نہیں جنگ ہوگا۔ جس سے یہ محسوس ہوا کہ پاکستان کے اقدامات سے بھارت کے ساتھ عرب ممالک کے تعلقات خراب ہو سکتے ہیں۔

۱۹۵۰ء کے آخر میں پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے امریکہ کا ایک غیر معمولی دورہ کیا تھا۔ سرد جنگ کے حوالے سے امریکہ کے نزدیک یہ دورہ اس لحاظ سے اہم تھا کہ یورپ پر امریکہ کو فوقیت دی گئی تھی اس طرح امریکہ کو عالم اسلام کے ساتھ تعلقات استوار کرنے میں مدد مل سکتی تھی جبکہ پاکستان کو بھارتی خطرے کے خلاف امریکی امداد درکار تھی۔ اس طرح گویا امریکہ اور عالم اسلام، دونوں کے ساتھ گہرے تعلقات قائم کرنا پاکستان کی خارجہ پالیسی کا بنیادی مقصد قرار پایا۔ بہرحال اس دورے سے پاکستان کو اقوام عالم میں اپنے آپ کو متعارف کرانے میں خاصی مدد ملی نیز کوریا میں جاری جنگ کے سبب پاکستان کو ۱۹۵۲ء تک پٹ سن اور دیگر چھوٹی موٹی اشیاء کی برآمد سے خاصا زرمبادلہ بھی ہاتھ آیا جو ایک طرح دیگر افرو ایشیائی ممالک کے [illegible] باعث بنا۔

۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان کو قتل کر دیا گیا۔ ادھر امریکہ میں ۱۹۵۲ء میں نئے ری پبلکن صدر آئزن ہاور آ گئے۔ لیاقت علی خان کے بعد خواجہ ناظم الدین نے امریکہ اور عالم اسلام کے ساتھ اپنے تعلقات میں توازن جاری رکھا لیکن ناظم الدین کے بعد سیکولر وزیر اعظم محمد علی آئے تو یہ پالیسی ایک دم تبدیل ہو گئی۔ محمد علی کو جو امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے ایک محلاتی سازش کے نتیجے میں واپس بلا کر وزیر اعظم مقرر کیا گیا تھا انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ امریکہ کی زیر سرپرستی برطانیہ، ایران، ترکی اور عراق کے ساتھ ایک فوجی معاہدے میں شریک ہو گئے جس کے بعد پاکستان کے امریکہ کے حاشیہ بردار ہونے میں

کسی کو کوئی شک و شبہ نہ رہا۔ بھارت نے شروع سے ہی بڑی ہوشیاری کے ساتھ پاکستان کو ناکام بنانے کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی' لہٰذا اس نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور پاکستان کے لئے عالم عرب میں پیدا ہونے والی مخالفانہ لہر کا مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا۔ اسرائیل کے قیام کے خلاف اقوام متحدہ میں پاکستان کی دلیرانہ جدوجہد اور ہر موقعہ پر عربوں کی حمایت کے باوجود آج پاکستان عربوں سے کٹ گیا تھا' اس لئے کہ عرب اسرائیل کے قیام کا ذمہ دار امریکہ کو گردانتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان امریکہ کا حاشیہ بردار بن کر عربوں اور مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا ہے۔

۱۹۵۲ء میں مصر کے انقلاب نے امریکہ اور برطانیہ کے خلاف عربوں کی نفرت کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ مصر میں نئی حکومت قائم ہوئی تو قوم پرستی کے جوش میں اس نے ملک کو مغرب کے سامراجی اثرات سے پاک کرنے کا آغاز کیا اور نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے لیا جس پر ۱۹۵۵ء میں برطانیہ' فرانس اور اسرائیل نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا۔

اتحاد اسلامی کا خواب اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا تھا جب تک پاکستان امریکہ کے حلقہ اثر سے باہر نہ آ جاتا' اس لئے کہ مسلم فلسطین میں اسرائیل کی صیہونی ریاست کے قیام میں امریکہ کا ہاتھ تھا اور عرب اسے اپنے خلاف دشمنی پر محمول کرتے تھے جبکہ پاکستان کے لئے امریکہ کی امداد ناگزیر تھی' ان حالات میں ایک ہی صورت ہو سکتی تھی' یعنی باقی مسلم ممالک کو بھی امریکہ کے زیر اثر لایا جائے۔ لیکن ۱۹۷۷ء میں حکومت پر جنرل ضیاء الحق کے قبضہ ہونے تک اس جانب کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی۔

مغرب کے ساتھ پاکستان کی فوجی وابستگی بین الاقوامی اسلامی یکجہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی مگر پاکستان کا مخمصہ یہ تھا کہ امریکہ کی امداد اور سرپرستی کے بغیر وہ بھارتی خطرے کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی پاکستان کی کارکردگی کوئی قابل رشک نہ تھی۔ خاص طور پر بین الاسلامی ریاستی مشاورتی کونسل کے قیام کے ضمن میں وزیر خارجہ ظفر اللہ خان اور ان کی وزارت نے سفارتی سطح پر جو کوششیں کیں وہ نقائص سے پاک نہ تھیں۔ بعد میں حکومت پاکستان نے

A Review of Pakistan's Relations with Islamic States

کے عنوان سے ایک دستاویز شائع کر کے خود اس کا اعتراف کیا کہ "ایسی بے ڈھنگی --- حکمت عملی پاکستان کی سیاسی کمزوری کا نتیجہ تھی ----- اگرچہ تجویز بہت عمدہ تھی مگر ایسے بلند و بالا منصوبے پر ابتدائی کام نہ ہونے کے برابر تھا"۔ چنانچہ جن ممالک کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی ان کے ساتھ گفت و شنید کے بغیر ہی تجویز کو عام کر دیا گیا اور اس طرح پاکستان نے خود ہی اس تجویز کو ناکام بنا دیا۔ جو لوگ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے پر مامور تھے انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مسلم ممالک کے سربراہان حکومت کی کانفرنس بھی اسی طرح کی کوئی شے ہو گی جو اس سے قبل دو مرتبہ کراچی میں منعقد ہو چکی ہیں۔

بعض مسلمان ممالک میں جو اپنے آپ کو "بڑا" سمجھ رہے تھے پاکستان کے بارے میں رقابت کا جذبہ پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان عالم اسلام کی قیادت سنبھالنے کا خواب دیکھ رہا ہے چنانچہ مصر کے شاہ فاروق نے اس تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستان تو ایسا سمجھ رہا ہے گویا اسلام ۱۴ / اگست ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوا ہے"۔ اسی طرح انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو کا کہنا تھا کہ "ہمیں پاکستان کی دوستی سے تو انکار نہیں مگر اسے اپنا لیڈر نہیں بنا سکتے"۔ شاہ فاروق کے بارے میں بہت سے لوگوں کو یاد ہو گا کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں تخت سے علیحدہ ہونے تک وہ اپنے آپ کو خلیفہ بننے کا حقدار خیال کرتے رہے تھے لہٰذا اسلامی اتحاد کے لئے پاکستان کا پیش پیش رہنا اسے ضرور کھٹکا ہو گا۔ پاکستانی سفارت کاروں کی یہ نااہلی تھی کہ وہ حالات کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

سعودی عرب کو بھی اپنی اہمیت کا کوئی کم احساس نہ تھا۔ دو مقدس ترین شہر مکہ اور مدینہ اس کے کنٹرول میں تھے۔ پھر یہ کہ اس کے نزدیک صحیح اور اصل اسلام ان کے ہاں تھا لہٰذا سعودی ویسے ہی باقی مسلمان ممالک کے مقابلے میں اپنے آپ کو اعلیٰ سمجھتے تھے۔ اس لئے قدرتی بات تھی کہ عمر رسیدہ ابن سعود نے (ان کا انتقال ۱۹۵۳ء میں ہوا تھا) عالم اسلام کی قیادت سنبھالنے کی پاکستان کی خواہش کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہو گا اور ان کے بعد ان کے بیٹے سعود بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے تو انہوں نے ساری توجہ اپنی بادشاہت مضبوط بنانے پر مرکوز رکھی لہٰذا اس سے بھی پاکستان کی کوشش میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہو گی۔

ایران: ایک اور اہم ملک ایران کی صورتحال بھی ان دنوں نہایت پیچیدہ تھی۔ وزیر اعظم محمد مصدق کی حکومت نے برٹش ایرانین آئل کمپنی قومی تحویل میں لے لی تھی اور ایران برطانیہ اور امریکہ کے ساتھ جھگڑے میں پھنسا ہوا تھا۔ ۱۹۵۲ء کا بیشتر عرصہ اسی جھگڑے کی نذر ہو گیا۔ ۱۹۵۳ء کے وسط میں مغربی طاقتوں کی شہ پر شاہ کے حق میں مظاہروں کے ذریعے مصدق کا تختہ الٹ دیا گیا تب یہ جھگڑا ختم ہوا۔

ایران کی قومی حکومت نے شروع میں پاکستان کی تجویز کا خیر مقدم کیا مگر جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ چنانچہ پاکستان کے اعلان کے چار ماہ کے اندر ہی ایرانی مجلس کے سپیکر' آیت اللہ کاشانی نے جو ملک کی ایک اہم مذہبی شخصیت تھے ایک اسلامی کانگرس بلانے کی ایرانی تجویز پیش کر دی جس میں پورے عالم اسلام کے راہنما شرکت کریں صرف یہی نہیں کہ مجوزہ کانگریس ایران میں منعقد ہو بلکہ تہران کو اس کا مستقل ہیڈ کوارٹر قرار دیا جائے۔

پاکستانی تجویز کی طرح ایرانی تجویز کے پیچھے بھی مسلم دنیا کی قیادت سنبھالنے کی خواہش جھلک رہی تھی لہٰذا اس کا بھی وہی انجام ہوا جو پاکستان کی تجویز کا ہوا تھا۔ ایران نے اپنی تجویز کا اعلان کیا تو تین ماہ تک تو پاکستان ادھر ادھر دیکھتا رہا بالآخر ناظم الدین نے بڑی بے دلی کے ساتھ آیت اللہ کی تجویز کا خیر مقدم کیا۔

مصر: مصر کے جولائی ۱۹۵۲ء کے انقلاب نے اپنی اس صلاحیت کا اظہار شروع کر دیا تھا کہ وہ عرب دنیا کی مجموعی سیاست میں تبدیلی لا کر اتحاد اسلامی کی کوششوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اتحاد اسلامی کا مستقبل کم از کم اگلے تین برس کے لئے مصر کی اندرونی سیاست کے ساتھ منسلک ہو گیا جہاں جلد ہی سیکولر اور دینی طاقتیں آپس میں گتھم گتھا ہو گئیں۔ یہی صورتحال کم و بیش ان دنوں پاکستان کی اندرونی سیاست میں پیدا ہو چکی تھیں۔

مصر میں ایک طرف فوجی حکمران ٹولہ تھا اور دوسری طرف وہاں کی اسلامی تحریک اخوان المسلمون۔ اخوان نے شروع میں باغی افسروں کی حمایت کی تھی لیکن جلد انہیں احساس ہو گیا کہ فوجی قیادت کا سیکولر ہونا لازم بات ہے چنانچہ انقلاب کے دس ہفتوں کے اندر اخوان کے چوٹی کے راہنما' شیخ حسن الحدیبی فوجی حکومت سے اختلاف کی بنا پر پارٹی قیادت سے مستعفی ہو گئے تب تک فوجی قیادت کا سیکولر چہرہ کھل کر سامنے آ چکا تھا۔ اس محاذ آرائی میں

ایک طرف ناصر اور ان کے ساتھی آزاد افسر تھے اور دوسری طرف اخوان اور ان کے ساتھ آزاد اور فوجی افسر تھے۔ اخوان کا زیادہ انحصار انور سادات' راشد مہنا' کمال الدین حسین' اور خاص کر عبد المنعم عبدالرؤف جیسے آزاد افسران پر تھا جو ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء تک اخوان کے ساتھ وابستہ رہے تھے۔ اگرچہ جنوری ۱۹۵۳ء میں اخوان سمیت تمام سیاسی جماعتیں ختم کر دی گئی تھیں لیکن حکومت کے ساتھ اپنے روابط کی بنا پر یہ تحریک مارچ ۱۹۵۴ء تک اپنی سرگرمیاں جاری رکھے رہی لیکن ۱۹۵۳ء میں حکومت کے ساتھ تعاون کے مسئلے پر اخوان کے اندر پھوٹ پڑ گئی جس کی وجہ سے تین اہم راہنماؤں کو عارضی طور پر پارٹی سے نکال دیا گیا۔ ادھر حکمران طبقے میں بھی ناصر کے حامیوں اور صدر جنرل نجیب کے طرفدار فوجی افسروں کے درمیان ٹکراؤ میں اضافہ ہو رہا تھا جس میں اخوان کا جھکاؤ جنرل نجیب کی طرف تھا۔

پاکستان میں اسلامی تحریک قادیانی مسئلے پر حکومت کے مدمقابل آ کھڑی ہوئی تھی۔ سر محمد ظفر اللہ خان قادیانی تھے اور علماء ان کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ پنجاب میں شدید فسادات ہوئے جنہیں فوج کے ذریعے فرو کرنا پڑا۔ جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو گرفتار کر کے ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور انہیں موت کی سزا سنائی گئی اس دوران محلاتی سازش کے نتیجے میں محمد علی بوگرا کو امریکہ سے لا کر اقتدار ان کے حوالے کر دیا گیا تاکہ وہ "واشنگٹن کے آدمی" کے طور پر ظفر اللہ کی مخالفت کرنے والے "مذہبی جنونیوں" سے نپٹ سکیں۔

جنرل اسلامک کانگرس

مصر اور پاکستان میں اس افراتفری کے عالم میں اخوان نے ۱۹۵۳ء میں یروشلم میں ایک اسلامی کانفرنس کا اہتمام کر ڈالا۔ اخوان کے اس اقدام کی خصوصی اہمیت یہ تھی کہ اس نے عالم اسلام میں غیر سرکاری سطح پر اسلامی تحریکوں کے کردار کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی حکومتی سطح سے ہٹ کر اتحاد اسلامی کے لئے یہ ایک اہم کوشش تھی اور یہ کوشش خلافت کے مسئلے کو چھیڑے بغیر کی گئی تھی۔

مصری حکومت میں ناصر ٹولہ اس کانفرنس سے چوکنا ہو گیا۔ یہی معاملہ پاکستان کا تھا کیونکہ اخوان کی ہمدردیاں حکومت مخالف اسلامی تحریک کے ساتھ تھیں۔

اس کانفرنس میں شرکت کے لئے عراق' اردن' مراکو' پاکستان' تیونس اور ایران سے وفود آئے اس کے علاوہ چین' امریکہ' کا کیشیس' شمالی عراق سے کردوں وغیرہ کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ کانگرس نے اپنا پرانا نام "جنرل اسلامک کانگریس" (جو ۱۹۳۱ء میں یروشلم میں ہونے والی کانگرس کو دیا گیا تھا) تبدیل کر کے المؤتمر الاسلامی العام رکھ لیا۔ ایک اسلامی سیکرٹریٹ کا قیام عمل میں لایا گیا اور پہلے سیکرٹری جنرل کے طور پر ڈاکٹر سید رمضان کا تقرر ہوا۔

فلسطین کے مسئلے پر کئی قراردادیں پاس ہوئیں۔ دو قراردادیں اسلامی بلاک قائم کرنے کے بارے میں منظور کی گئیں (جس پر مئی ۱۹۵۲ء میں کراچی میں بحث ہوئی تھی)

کانگریس نے مشرق و مغرب کے بڑے بلاکوں سے الگ ایک اسلامی محاذ کے لئے دستور تیار کرنے کا مطالبہ کیا۔

یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ اللہ کے وعدہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اسلام کی سرحدوں کے تحفظ کی خاطر آگے بڑھا جائے۔

کانفرنس کا فوری ردعمل مصر میں ظاہر ہوا جہاں اس کانفرنس سے اخوان کے وقار میں اضافہ ہوا۔ کانگرس کے سیکرٹری جنرل کا تعلق مصر سے تھا۔ اسلامی معاملات میں مصر کو اپنا روایتی کردار ادا کرنے کا یہ اہم موقع مل رہا تھا۔ ناصر ٹولے کے لئے اخوان کی اہمیت کو نظرانداز کرنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سے بھی بڑی ایک اسلامی کانفرنس بلانے کا عندیہ ظاہر کیا جس میں مصر' پاکستان اور سعودی عرب کے راہنماؤں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ اس کانفرنس کا مقصد مصر میں اخوان کے حق میں ابھرنے والے جذبات کو سرد کرنا اور حکومت مصر کو اسلام کا چیمپئن ظاہر کرنا تھا۔

مصر کو فوری تائید پاکستان سے ملی جیسے اندرون ملک اسلامی تحریک سے مصر جیسے حالات کا سامنا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پاکستانی عوام پر ابھی تک اسلامی بلاک قائم کرنے کی دھن سوار تھی جس سے پاکستان کی حکومت کو بھی وہی فوائد حاصل ہوتے جن کی تلاش مصر کی حکومت کو تھی۔

نومبر ۱۹۵۳ء میں ملک عبدالعزیز ابن سعود کا انتقال ہو گیا اور ان کے بیٹے ولی عہد شہزادہ سعود بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے۔ سعود خود بھی اپنے ملک کو بین الاقوامی سیاست سے اس عدم توجہی اور کنارہ کشی سے باہر نکالنا چاہتا تھا جو ان کے والد کے دور میں طاری ہو گئی تھی۔ انہیں تخت نشینی پر مبارکباد دینے کے لئے جو وفود آئے تھے ان میں ناصر کی سربراہی میں مصر کا وفد بھی شامل تھا۔ سعود نے خود ہی ناصر سے مجوزہ اسلامی کانفرنس کا ذکر چھیڑ دیا جس پر ظاہر ہے ناصر خوشی سے پھولے نہ سمائے ہوں گے۔

۱۵ / فروری ۱۹۵۴ء کو جنرل نجیب نے استعفیٰ دے دیا تو ایک دم مصری حکومت کی مشکلات اپنی انتہا کو پہنچ گئیں۔ آزاد افسران ایک بحران سے دوچار ہو گئے کیونکہ نجیب نے ان کے ساتھ پالیسی اور اقتدار کی تقسیم جیسے معاملات پر اختلافات کی بنا پر یہ استعفیٰ دیا تھا۔ تین روز بعد' ۲۸ / فروری ۱۹۵۴ء کو اخوان کی زیر قیادت اٹھنے والی عوامی حمایت کی لہر نے نجیب کو دوبارہ عہدۂ صدارت پر لا کر بٹھا دیا جس سے ناصر ٹولے پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اخوان اور نجیب دونوں سے تصادم کے علاوہ چارہ نہیں۔ لہٰذا انہوں نے ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے مجوزہ اسلامی کانفرنس پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ (جاری)

بقیہ : افکار معاصر

دوران ایک اخبار کے رپورٹر سے ان کی گفتگو میں ہمیں خود اس کا مشاہدہ ہوا۔ یہ عین اس دن کی بات ہے جب عمران خان تحریک انصاف کا اعلان کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ "عمران خان کی ڈور کوئی اور ہلا رہا ہے' ان سے اسلام کی توقع نہیں"۔ ایسی بات کہنے کا وہ وقت موزوں نہ تھا۔ اگلے روز اخبارات کی جلی سرخیوں میں عمران خان کے ساتھ ان کا بیان ان سے عوامی جذبات کے تنفر کا باعث بنتا۔ جیسے کہ قاضی حسین احمد صاحب کے ساتھ ہوا۔ یہ عین ضیاء الحق مرحوم کی شہادت کا دن تھا' جب اتفاق سے روزنامہ جسارت میں مرحوم کے خلاف ان کا بیان اخبار کی ہیڈ لیڈ بنا۔ "یہ نفاذ شریعت کا نہیں انسداد شریعت کا بل ہے"۔

قارئین! حکمت اور فراست مرد مومن کی صفت ہے تو ہمیں تمام تر احترام کے باوجود یہ کہنے دیجئے کہ بیشتر دینی سیاسی رہنماؤں کی فراست میں گویا ایتھوپیا کا قحط ہے۔ عوامی نفسیات سے ناآشنائی اور موقع محل کے مطابق اظہار یا خاموشی کی ضرورت سے آگاہی وہ پہلو ہے جو تبحر علمی کے باوجود دینی سیاسی رہنماؤں میں عنقا ہے۔ عوام کو ساتھ ملانے میں اور آپس میں ان کے مل بیٹھنے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

یاسر عرفات عرب دنیا کے مایوس ترین انسان ہیں

امریکہ عرب ریاستوں پر اسرائیل کو ہمیشہ ترجیح دیتا آیا ہے

شاہ حسین سے خدشہ ہے کہ وہ مغربی کنارے کے بارے میں اسرائیل سے خود کوئی معاملہ نہ کرلیں

تحریر : شمس العارفین

بھارت میں بی ۔ جے ۔ پی جیسی انتہا پسند قوم پرست جماعت کی کامیابی کی دھول ابھی بیٹھی نہیں تھی کہ ۲۹ مئی ۱۹۹۶ء کو اسرائیل میں ہونے والے انتخابات میں دائیں بازو کی انتہا پسند جماعت لیکوڈ پارٹی نے لیبر پارٹی کو شکست سے دوچار کر دیا۔ مسلمانوں کی خارجہ حکمت عملی کے اعتبار سے دو اہم ممالک میں انتہا پسندوں کی فتح مسلمانان عالم کے لئے تشویش کا باعث ہے۔ کیا یہ فتوحات مستقبل میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا پیش خیمہ بنیں گی؟ ایسے کئی سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ لیکن اس وقت ہمارا مطمع نظر صرف اسرائیلی انتخابات سے مشرق وسطیٰ پیدا ہونے والی متوقع تبدیلیوں کا جائزہ لینا ہے۔

۲۹ مئی بروز بدھ اسرائیلی انتخابات کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وزیر اعظم کا چناؤ براہ راست ووٹوں کے ذریعے عمل میں آیا۔ چنانچہ لیکوڈ پارٹی کے امیدوار بن یامین نتن یاھو نے ۲۹۰۰۰ ووٹوں کے فرق سے سابق وزیر اعظم شمعون پیریز کو شکست دے دی۔ نتن یاھو نے ۵۰ اعشاریہ ۴ فیصد جبکہ شمعون پیریز نے ۴۹.۵ فیصد ووٹ حاصل کئے گویا فتح و شکست کا فرق ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ نتن یاھو کو زیادہ تر یہودیوں کے ووٹ ملے جبکہ پیریز کے حصے میں عربوں کی اکثریت کے ووٹ آئے ہیں۔ اس نئے طریقہ انتخابات کا اصل مقصد یہ تھا کہ چھوٹی پارٹیوں کو بے جا فوائد حاصل کرنے سے روکا جائے۔ لیکن یہ انتخابات الٹے پیریز کے گلے پڑ گئے ہیں اگر پرانا طریقہ کار بحال رہتا تو زیادہ امکان یہی تھا کہ پیریز دوسری چھوٹی پارٹیوں سے مل کر حکومت بنا لیتے۔ اس وقت بھی پارلیمنٹ میں انکی لیبر پارٹی کی اکثریت ہے اور لیکوڈ پارٹی سے ان کی چار نشستیں زیادہ ہیں۔ لیکوڈ پارٹی کو بحیثیت مجموعی پچھلے انتخابات کے مقابلے میں کم سیٹیں ملی ہیں یہی حال لیبر پارٹی کا رہا ہے نتن یاھو کی لیکوڈ پارٹی کے پاس ۳۱ نشستیں ہیں، جبکہ وزارت سازی کے لئے انہیں ۶۱ ممبران اسمبلی کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت وہ دیگر ہم خیال جماعتوں کی مدد سے پوری کریں گے۔ ان کی فطری حلیف انتہا پسند مذہبی جماعتیں ہیں۔ جن کو ان انتخابات میں ۲۵ سیٹیں ملی ہیں۔ اس طرح ایک اور قومی مذہبی جماعت کو ۱۰ اور شاس پارٹی کو گیارہ نشستیں حاصل ہوئی ہیں۔ چنانچہ نتن یاھو آسانی سے حکومت بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ان انتخابات میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں، مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک اور یاسر عرفات کی دلی ہمدردیاں لیبر پارٹی کے ساتھ تھیں۔ کیونکہ امریکہ کے زیر اثر شروع ہونے والی امن بات چیت کے عمل کی پیریز نے مکمل تائید کی تھی۔ لیکن اسرائیل کے حالیہ انتخابات نے امریکہ کے لئے بہت سی مشکلات پیدا کر دی ہیں، ان انتخابات سے سب سے زیادہ مایوس آدمی یاسر عرفات ہیں جن کی آزاد فلسطینی حکومت کا سارا انحصار اب لیکوڈ پارٹی کی پالیسیوں پر ہے۔

بن یامین نتن یاھو سابقہ آرمی کمانڈو ہیں۔ ان کی انتخابی مہم کا بنیادی نکتہ امن مع تحفظ تھا (Peace with security) ۔ انہوں نے خصوصی طور پر اسرائیل فلسطین معاہدے کو اپنا ہدف بنایا۔ یہ معاہدہ ستمبر ۱۹۹۳ء میں ہوا تھا۔ اس کی بدولت ہی یاسر عرفات فلسطینی حکومت بنا سکے ہیں۔ شمعون پیریز پر سب سے زیادہ تنقید اسی حوالے سے کی گئی۔ فروری اور مارچ میں اسرائیل کے مختلف مقامات پر ہونے والے خود کشی پر مبنی بم دھماکوں سے نتن یاھو کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ اسلامی تحریک حماس کی طرف سے کئے جانے والے ان چار بم دھماکوں میں ۶۷ اسرائیلی ہلاک ہو گئے تھے۔ نتن یاھو نے لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھے ہوئے خوف اور غیر یقینی صورتحال کو بہت مہارت کے ساتھ اپنے حق میں استعمال کیا اور بالآخر کامیابی حاصل کر لی۔ شمعون پیریز پوری انتخابی مہم کے دوران ووٹرز کو اس بات کا یقین دلاتے رہے کہ اگر وہ امن کے خواہش مند ہیں تو انہیں کامیاب بنائیں۔ دوسری صورت میں امن کا عمل خطرے سے دوچار ہو جائے گا۔ ان کی یہ بات صرف انتخابی نعرہ بازی نہیں تھی بلکہ بڑی حد تک سچائی پر مبنی ہے۔

لیکوڈ پارٹی کی حکومت کی تشکیل کے بعد مشرق وسطیٰ کا سیاسی منظر نامہ کیا ہو گا۔ یہ اہم ترین سوال ہے جو ماہرین کے ذہنوں میں گردش کر رہا ہے۔ ابھی تو نئے منتخب وزیر اعظم بن یامین نتن یاھو مخلوط حکومت کی تشکیل کے لئے ممکنہ حلیفوں سے گفت و شنید میں مصروف ہیں۔ توقع ہے کہ وہ ۱۷ جون تک اٹھارہ رکنی کابینہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہی ان کی پالیسیوں کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ لیکن انتخابی مہم کے دوران کی جانے والی تقریروں اور انتخابات کے بعد شائع ہونے والے بیانات سے بہت حد تک ممکنہ صورتحال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حالیہ اسرائیلی انتخابات کے نتائج سے امریکہ اور اس کے یورپی حلیفوں، فلسطین کے سربراہ یاسر عرفات، مشرق وسطیٰ کی مسلم ریاستوں اور اسلامی تحریک حماس کو گہری دلچسپی ہے۔ یہی وہ بڑے بڑے عناصر ہیں جن پر مستقبل کی اسرائیلی پالیسیاں براہ راست یا بالواسطہ اثر انداز ہوں گی۔ نیتجتاً ان کی جوابی حکمت عملی سے حالات کا رخ متعین ہو گا۔ امریکہ جس کی خارجہ پالیسی میں اسرائیل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے چنانچہ صدر بل کلنٹن نے اسرائیلی انتخابات کے نتائج کے فوراً بعد ہی ایک بیان میں مشرق وسطیٰ میں اپنی سابقہ پالیسی کو جاری رکھنے کا عندیہ دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر امن کے عمل کو کوئی خطرہ لاحق ہوا تو ہم اس خطرے کو دور کرنے کا بھرپور عزم رکھتے ہیں۔ لیکن امریکی صدر کے اس عزم کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ نومبر میں ہونے والے امریکی صدارتی انتخابات ہیں جن میں کلنٹن کا مقابلہ ری

امیدوار باب ڈول
طاقتور اور تجربہ کار امیدوار باب ڈول
ایک معروف حقیقت
) سے ہے۔ یہ ایک معروف حقیقت
لابی امریکہ کے صدارتی انتخابات میں
کی حامل ہے۔ چنانچہ کوئی امیدوار یہودی
ابات کے دنوں میں ناراض کرنے کا خطرہ
لے سکتا۔ اس لئے قوی امکان یہی ہے کہ
نئی حکومت کے بننے تک امریکہ کوئی واضح
نیار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوگا اگرچہ بل
سرائیل پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گے لیکن
در پر وہ مشرق وسطی میں اپنے عرب حلیفوں کو
تسلی دینے پر ہی اکتفا کریں گے۔ اگر وہ انتخابات
دوبارہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر ان کی پوزیشن
مضبوط ہو گی اور زیادہ اعتماد کے ساتھ اسرائیل
اپنی پالیسیاں منوا سکیں گے۔ لیکن یہ حقیقت پیش
رہنی چاہئے کہ امریکہ عرب ریاستوں پر اسرائیل
کو ہمیشہ ترجیح دیتا آیا ہے۔

جہاں تک عرب ریاستوں کا تعلق ہے وہ اسرائیلی
انتخابات کے نتائج سے سخت تشویش میں مبتلا ہیں۔
اس کا ایک مظہر تو یہ ہے کہ مصر کے صدر حسنی
مبارک اور اردن کے شاہ حسین اور یاسر عرفات کے
درمیان عقبہ کے مقام پر ۵ جون کو ایک ملاقات ہوئی
ہے۔ ان سربراہان کی اصل کوشش مشترکہ عرب محاذ
(Common Arab Front) تشکیل دینے کی ہے
تاکہ نئی اسرائیلی حکومت کی پالیسیوں کا متحد ہو کر مقابلہ
کیا جا سکے۔ شام اور اسرائیل کے باہمی امن
مذاکرات گولان کی پہاڑیوں کے قبضے کی بدولت پہلے
ہی سے کھٹائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اسرائیل میں نئی
تبدیلیوں سے مزید سرگرمی کے امکانات ہیں جس کے
نتیجے میں علاقے کی صورتحال اور خراب ہو جائے گی۔
سعودی عرب نے اب تک محتاط رویے کا مظاہرہ کیا
ہے۔ بظاہر وہ انتظار کرو اور دیکھو (Wait and See)
کی حکمت عملی پر عمل کر رہا ہے۔ اگر مشرق وسطی کے
مسلم ممالک کوئی مشترکہ محاذ بنانے میں کامیاب ہو
جاتے ہیں جس کے امکانات موجود ہیں تب اسرائیل
پر دباؤ بڑھ جائے گا لیکن بدقسمتی سے ان ممالک کا مسئلہ
یہ ہے کہ ہر معاملے میں ان کی نظریں امریکہ پر لگی
رہتی ہیں چنانچہ مشترکہ عرب محاذ سے صرف یہ فائدہ
ہو گا کہ امریکہ پر امن کے عمل کو جاری رکھنے پر زور
دیں گے۔ یوں امریکہ پر انکا انحصار مزید بڑھ جائے گا۔
دوسرا ان کے آپس میں بہت سے اختلافات ہیں جن کا
اظہار ۵ جون کو عقبہ میں اردن کے شاہ حسین نے بھی
کیا ہے۔ اس لئے عرب ممالک سے کسی مضبوط اتحاد

کی توقع نہیں۔
مشرق وسطی کے حالیہ تناظر میں سب سے زیادہ
مایوس آدمی یاسر عرفات ہیں۔ جن کے بارے میں نتن
یاہو، نے منتخب وزیر اعظم اسرائیل' نے انتخابی مہم
کے دوران یہ تک کہہ دیا تھا کہ "میں یاسر عرفات سے
ہاتھ ملانا بھی پسند نہیں کرتا" ۲۹ مئی کو ہونے والے
انتخابات کے بعد فلسطینی کابینہ نے انتہائی گھبراہٹ میں
اقوام متحدہ سے اپیل کی ہے کہ "وہ امن کی کوششوں
کی رفتار میں اضافہ کرے" یاسر عرفات جو کہ اوسلو
معاہدے کے بعد پورے کے پورے امریکہ کی گود میں
جا گرے ہیں عجیب مخمصے میں پھنس گئے ہیں۔ اگر نئے
اسرائیلی وزیر اعظم نتن یاہو جن کو عرف عام میں بی بی
(Bibi) کہا جاتا ہے نے انتخابی مہم کے دوران کئے گئے
وعدوں کے مطابق مغربی کنارے کے شہر الخلیل سے
اسرائیلی فوجوں کی بڑی تعداد کو واپس نہ بلایا تو یاسر
عرفات کی حکومت کی کوئی وقعت نہیں رہے گی۔ اسی
لئے یاسر عرفات نے اپنا کیریئر بچانے کے لئے اردن
کے شاہ حسین اور مصر کے حسنی مبارک سے عقبہ کے
مقام پر ملاقات کی ہے۔ لیکن یاسر عرفات کا ایک مسئلہ
یہ بھی ہے کہ انہیں شاہ حسین پر بھی بہت زیادہ اعتماد
نہیں ہے۔ بلکہ فلسطینیوں کو تو شاہ حسین سے خدشہ
ہے کہ کہیں وہ مغربی کنارے کے بارے میں اسرائیل
سے خود کوئی معاملہ نہ کر لیں کیونکہ ۱۹۶۷ء کی جنگ
سے پہلے یہ علاقہ اردون کے کنٹرول میں تھا۔
بہرصورت نئی اسرائیلی حکومت یاسر عرفات کے سیاسی
کیریئر کے لئے بہت بڑا مسئلہ بن گئی ہے۔ یاسر عرفات
اس مشکل صورتحال سے کیسے مقابلہ کریں گے؟ وہ
کامیابی کے ساتھ اس بحران سے نکل آئیں گے یا انکی
شخصیت قصہ ماضی بن جائے گی' یہ آنے والا وقت ہی
بتائے گا۔

مابعد انتخابات کی صورتحال میں اسلامی تحریک
حماس کا کردار انتہائی اہم ہے۔ لیکوڈ پارٹی اور اس کے
حلیفوں کی انتہا پسند حکمت عملی سے فلسطینیوں میں
اسلامی تحریک کی ہردلعزیزی میں اضافہ ہونے کے
روشن امکانات ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں خصوصا
اوسلو معاہدے کے بعد یاسر عرفات کی پالیسیوں کی وجہ
سے حماس کی مقبولیت کافی بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ خیال
یہی ہے کہ یہ بحرانی کیفیت حماس کے حق میں جائے گی
لیکن اس روشنی کے پیچھے کئی اندھیرے پوشیدہ ہیں جو
سراپا انتظار ہیں۔ انہیں نظرانداز کرنا کسی طرح بھی
مناسب نہیں ہے۔ مشرق وسطی کی عرب مسلم
ریاستیں اسرائیلی انتہا پسندانہ پالیسیوں کا مقابلہ کرنے

کے لئے ... معاملات ...
اور تھوڑا لو کے اصول" پر یاسر عرفات
کوشش کی جائے گی۔ امکان یہی ہے کہ یاسر عرفات
حماس کے خلاف مزید سخت رویہ اپنائیں گے۔ شرم
الشیخ میں ہونے والی امن کانفرنس کے اعلامیہ کا ایک
نقطہ یہ بھی ہے کہ اسلامی تحریکوں کو مدد دینے والے
ذرائع کا پتہ لگایا جائے اور اس کی روک تھام کے لئے
اقدامات کئے جائیں۔ اس کے لئے جو بھی قدم اٹھایا
جائے گا اس کی براہ راست زد حماس پر پڑے گی۔
چنانچہ حماس کے لئے نئے دور ابتلاء کا آغاز ہونے والا
ہے اس لئے انہیں بھی اب اپنی حکمت عملی میں
تبدیلی پیدا کرنا ہو گی جس سے فلسطینیوں اور مسلم
ممالک میں انکی مقبولیت میں اضافہ بھی ہو۔ نئی انکا
پچھاڑ میں ان کا وجود بھی برقرار رہے اور وہ ایک تشدد
پسند جماعت کی بجائے حقیقی اسلامی تنظیم کے طور پر
سامنے آئے۔ اس کے لئے انہیں صبر و برداشت سے
کام لینا ہوگا اور قربانیاں دینا ہوں گی۔
مستقبل قریب کا تناظر نئے منتخب اسرائیلی وزیر
اعظم کے لئے بھی کم مشکل نہیں۔ نئی حکومت کی
تشکیل کے بعد جب انتخابی مہم کا جوش ٹھنڈا ہو گا او
تلخ زمینی حقائق سامنے آئیں گے تو وہ یقینا اپنی حکمت
عملی پر نئے سرے سے سوچنے پر مجبور ہوں
امریکہ' اس کے حلیفوں اور عرب ریاستوں کے
مقابلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا انتخابی مہم کے د
نظر آتا تھا۔ بن یامین نتن یاہو اپنے انتہا پسند
نسل پرست حلیفوں اور بیرونی دباؤ کے دو پاٹ
پس رہے ہوں گے۔ ایسی صورت میں
عربوں سے نرمی کی توقع بے جا نہ ہو گی۔ انتخ
بعد کی گئی تقریروں میں ان کے لہجے میں وہ
جوش نہیں تھا جو انتخابی مہم کے دوران دیکھ
تھا۔ انتخابات کے بعد انہوں نے یہ بات کہی
تمام ہمسایوں کے ساتھ امن بات چیت
ہیں ایسا امن جو حقیقی ہو یعنی امن
(Peace with Security) انہوں
ہم اس کے لئے اردن اور مصر سے پہلے
امن تعلقات کو مضبوط کریں گے اور
بھی بات چیت جاری رکھیں گے'
نہیں ہے کہ وہ اپنے تمام وعدوں
انہوں نے انتخابی مہم کے دوران
فلسطین امن معاہدہ' الخلیل سے
واپسی وغیرہ اپنے موضوعات

مذہب اور سیاست میں کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی

"خمینی کا انقلاب "کیسٹ انقلاب تھا' جب کہ ہمارا فیکس کا انقلاب ہو گا"

خلیج کی جنگ نے بر سر اقتدار گروپ کی قانونی حیثیت کو مشکوک بنا کر سیاسی سطح پر ایک بحران کھڑا کر دیا ہے

لندن کے کنگ کالج میں سوشل انتھروپالوجی کی پروفیسر مداوی الرشید کی

ایک فکر انگیز تحریر جو سعودی اسلامسٹوں کی جلاوطن اپوزیشن کی صحیح صورتحال کی آئینہ دار ہے

"خمینی کا انقلاب' کیسٹ انقلاب تھا' جب کہ ہمارا فیکس کا انقلاب ہو گا"۔ یہ الفاظ سعد الفقیہ کے ہیں' جو لندن میں سعودی اسلامسٹوں کی جلاوطن اپوزیشن تنظیموں میں سے ایک "سعودی عرب میں جائز حقوق کے دفاع کی کمیٹی" (سی ڈی ایل آر ایس) کے ڈائریکٹر ہیں۔ فیکس مشین جیسی الیکٹرانک کمیونیکیشن کے استعمال سے کمیٹی کے بارے میں بین الاقوامی ذرائع ابلاغ اور سعودی مملکت میں توجہ بڑھ رہی ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ فقیہہ اور سی ڈی ایل آر کے ترجمان محمد المعری ہر منگل کو ۸۰۰ سعودی باشندوں کو جبکہ ۲۰۰ کی تعداد میں سفارت خانوں اور پریس کے مراکز کو فیکس روانہ کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فیکس مملکت کے کنٹرول سے باہر ہیں۔ فیکس میں کمیٹی کا ہفتہ وار اعلامیہ ہوتا ہے' جبکہ اعلامئے میں اندرون ملک انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور گرفتاریوں اور شاہی خاندان کے افراد کی کرپشن کی رپورٹیں ہوتی ہیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ اعلامئے' رپورٹیں اور کبھی کبھار کے پمفلٹ سعودی باشندوں کو کمیٹی کے پروگرام اور تبدیلی اور اصلاح کے ایجنڈے سے باخبر رکھتے ہیں۔

سعودی عرب کی اسلامی اپوزیشن نے اس طرح ایک ایسی مملکت میں عدم استحکام کی فضا ہموار کی ہے' جسے سیاسی اسلام کی مختلف علامات سے ابھی تک محفوظ خیال کیا جاتا تھا' جو دیگر عرب ملکوں میں ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ سعودی قضا کی سب سے اہم ترین بات ایک ایسی ریاست میں اسلامی اپوزیشن کا جڑ پکڑنا ہے جسے شریعہ اور اسلامی قانون پر عمل پیرا سمجھا جاتا ہے' دوسرے عرب ملکوں کے مقابلے میں جہاں اسلامی گروہ سیکولر مملکتوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہیں' اور جو شریعت کو شادی' طلاق اور وراثت کے پرائیویٹ دائرے تک محدود رکھتے ہیں' سعودی ریاست سیاست اور حکومت کے تمام شعبوں پر اسلام کے اطلاق کا دعویٰ کرتی ہے۔ اس دعوے کے علی الرغم سعودی عرب میں اسلامی اپوزیشن کا احیاء صورتحال کو زیادہ پیچیدہ بناتا ہے۔

اپوزیشن کی پیدائش

سعودی عرب میں یہ اسلامسٹ کون لوگ ہیں؟ اس سوال کا جواب ایک ایسے ملک کے حوالے سے بہت مشکل ہے' جس میں سیاسی جماعتوں' آزادانہ اجتماعات' عوامی مباحث یا سیاسی جمود پر تنقید پر پابندی ہے۔ تاہم گزشتہ پانچ سال کا عرصہ "انفتاح" (کشادگی) کی غیر معمولی فضا سے عبارت ہے۔ اس فضا کا نتیجہ حکومت اور اس کے مستقبل سے متعلق بڑے موضوعات پر کھلے عام بحث و مباحثہ ہے۔ مساجد اور مذہبی یونیورسٹیاں اصل میں وہ جگہیں ہیں جہاں یہ مباحث ہوتے ہیں اور ان کا نتیجہ مقالوں اور جمعہ کے خطبات کی ٹیپ ریکارڈنگ اور ان کی تقسیم اور بادشاہ کو یادداشتوں اور فیکس کی ترسیل ہے۔ سعودی عرب میں اس طرز کی کھلی سیاسی سرگرمیوں کا کبھی وجود نہ تھا۔

مذکورہ سرگرمیوں کی ایک مثال ایک درخواست ہے' جو فروری ۱۹۹۱ء کو بادشاہ کو پیش کی گئی اور جس پر مذہبی طبقے کے ۵۲ ممبروں کے دستخط ہیں۔ اس درخواست پر علماء کے سربراہ شیخ عبدالعزیز بن باز' ججوں' یونیورسٹی کے پروفیسروں اور واعظین کے بھی دستخط تھے۔ اس کے ۱۲ نکات کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ شرعی قوانین کے سلیبس کو حکومت کے تمام شعبوں میں راہنما اصول کے طور پر بحال کیا جائے۔ درخواست گزاروں کے پیش نظر "ریاست اور چرچ" کے درمیان تعلقات کے مبادیات کی تبدیلی اور سعودی عرب میں ایک "اسلامی حکومت" کے قیام کا مطالبہ تھا' جو آیت اللہ خمینی کے ولایت فقیہہ (پیشوائیت کے اقتدار) کے اصول پر قائم تہران کی شیعہ اسلامی حکومت سے کسی حد تک مماثلت رکھتی ہو۔

درخواست کے بعد ستمبر ۱۹۹۲ء میں ۴۵ صفحات کی ایک دستاویز بعنوان "مشاورت کا میمورنڈم" پیش کی گئی۔ اس پر ۱۰۰ علماء کے دستخط تھے اور یہ ابن باز کے نام تھی۔ آر ہریئر ڈیک میجین (R.Hrair Dekmejian) دستاویز کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے لہجے کو اہمیت دیتا ہے' جس میں اس کی رائے میں ریڈیکل اور انحرافی مطالبات کو آگے بڑھایا ہے۔ ان میں اسلامی پادریوں' اسکالروں اور اساتذہ پر حکومت کی طرف سے عائد شدہ تمام پابندیوں کے خاتمے' حکومت کی تمام ایجنسیوں' وزارتوں اور سفارت خانوں کے کاموں میں علماء کی شرکت اور ایک اعلیٰ مذہبی آئینی عدالت کے قیام کا مطالبہ شامل ہے' جو تمام قوانین کا جائزہ لے۔ ان کی چھانٹی کرے اور اسلام کے ساتھ ان کی مطابقت کو یقینی بنائے۔ دیگر مطالبات غیر ملکی جرائد پر سنسر شپ' مسلم مقاصد کی حمایت' عدالتی نظام میں اصلاحات' پولیس کے اختیارات پر قدغن اور فوجی قوت میں اضافے پر مرتکز ہیں۔

اسلامسٹ' داخلی اور خارجی

مذکورہ درخواستیں بالخصوص خلیجی بحران کے دوران حکومتی اقدامات کے خلاف مذہبی طبقے میں پائی جانے والی بے چینی کے عروج کا مظہر تھیں۔ تاہم جنگ کے بعد ابھرنے والی اپوزیشن کا ماخذ دو ذرائع ہیں۔ ان میں سے ایک وہابی علماء اور فقیہ ہیں' جو مساجد اور لیکچرہالوں کو اپنی بے اطمینانی کے اظہار کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ گزشتہ تین دہائیوں میں ریاست کی قائم کردہ اسلامی یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ ہیں۔ مذہبی تعلیم کے مراکز کے طور پر ایسی یونیورسٹیوں کا قیام مقامی سطح پر مذہبی علم اور مہارت کی بڑھتی ہوئی ضرورت کے جواب میں نہیں تھا بلکہ شاہ فیصل' جو ملک کو اسلامی دنیا کی قیادت کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے' کے دور میں یہ مملکتی پالیسی کا حصہ تھا۔ اگر ان یونیورسٹی گریجویٹوں کو انتظامیہ یا مذہبی اداروں میں کھپایا نہ جاسکتا' تو انہیں تبلیغ اور اسلامی مراکز اور مدارس کے قیام کے لئے بیرون ملک بھیج دیا جاتا۔

اپوزیشن کے سرکردہ افراد میں نجد کے علاقے کے دو مذہبی راہنما شیخ صفر الحوالی اور شیخ سلمان العودہ ہیں۔ جس رجحان کی وہ نمائندگی کرتے ہیں' اسے اکثر "نیو فنڈامنٹلسٹ" یا "نیو کنفرمسٹ" علماء کہتے ہیں۔ یہ نئی اور نسبتاً نوجوان شخصیات اپنے پیش رو سرکردہ وہابی علماء سے اس پہلو سے انحراف کرتی ہیں کہ وہ دینیات' اخلاقیات اور موزوں اسلامی کردار کے موضوعات سے ہٹ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کے جمعہ کے خطبات ملکی سیاست اور بین الاقوامی اور علاقائی امور پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جنگ خلیج کے وقت سے ان کے بیانات میں سعودی عرب میں غیر ملکی افواج کو مدعو کرنا' اسرائیل کے ساتھ امن مذاکرات' خود خاندان سعود کی قانونی حیثیت اور ملک میں ایک مضبوط اسلامی فوج کی تیاری کے موضوعات باقاعدگی سے شامل ہوتے ہیں۔

اپوزیشن کے زیادہ جنگجو ممبران نے ایک سوسائٹی کی تشکیل کی ہے' جو اسلامی احیا کمیٹی کہلاتی ہے۔ اس گروپ پر ایران کے اسلامی انقلاب کا اثر و نفوذ اس کے ولایت فقیہ کے نظریئے کو اختیار کرنے سے واضح ہوتا ہے۔ گروپ وہابی ازم کی تعلیمات کے زیر اثر سعودی عرب میں ایک جدید خالص مذہبی حکومت قائم کرنے کا خواہاں ہے۔ برسراقتدار گروپ میں اخلاقی انحطاط اور بدعنوانی کی نشاندہی اس گروپ کی حکومت پر نکتہ چینی کا مرکزی نکتہ ہے۔ مذکورہ گروہ کے زیادہ بے باک ممبران شیخ حوالی اور عودہ گرفتار ہوچکے ہیں۔ تاہم ان کے حامی بادشاہ کے نام فیکس اور خفیہ ٹیپوں کے ذریعے' جن میں شاہی خاندان اور اس کی کرپشن پر تنقید کی گئی ہے' حکومت پر حملے جاری رکھے ہوئے ہیں۔

سعودی عرب میں اسلامسٹوں کا پس منظر بالعموم غیر قبائلی' شہری مڈل کلاس سے ہے۔ ڈیک میمکن کے مطابق بہت سے اسلامسٹ' جنہوں نے دو عرضداشتوں پر دستخط کئے' مذہبی لوگ ہیں اور ان کی غالب اکثریت کا تعلق نجد سے ہے' جو وہابی ازم کا گڑھ اور سعودی بادشاہت کی طاقت کا مرکز ہے۔ اپوزیشن کے کچھ ممبران ملک کے اندر سرگرم عمل ہیں' جبکہ حکومت کی بڑھتی ہوئی گرفت اور گرفتاریوں کے نتیجے میں اسلامسٹوں نے جلاوطن اپوزیشن قائم کی ہے۔ اسلامسٹوں کی یہ دوسری کیٹیگری ہے' جو اس وقت لندن کو بنیاد بنا کر کام کر رہی ہے۔ یہاں میں سی ڈی ایل آر اور اس کی معاون تنظیمی کمیٹی برائے مشاورت و اصلاح (سی اے آر) کا حوالہ دوں گا۔ جس کی قیادت اسامہ بن لادن کر رہے ہیں۔

مئی ۱۹۹۳ء میں ٦ سعودی باشندوں نے سی ڈی ایل آر کی بنیاد رکھی۔ تنظیم میں وکیل' شاعر اور ٹیکنوکریٹ حضرات شامل تھے۔ اس کے بانیوں میں سے ایک محمد المصری کو گرفتار اور بعد میں رہا کر دیا گیا۔ وہ اپنے حمائتیوں کے ساتھ سعودی عرب سے نقل مکانی کر کے اپریل ۱۹۹۴ء میں لندن پہنچے جہاں انہوں نے سی ڈی ایل آر ایس کا مرکزی دفتر قائم کیا۔ مصری نے سیاسی پناہ کی درخواست دی۔ تاہم سعودی عرب کے ساتھ اپنے اقتصادی روابط کے پیش نظر برطانیہ نے انہیں سیاسی پناہ دینے سے انکار کیا اور انہیں ملک چھوڑنے کے لئے کہا۔ مصری نے ڈیپورٹیشن کے خلاف عدالت سے رجوع کیا۔ تب سے وہ اور ان کے حامی لندن میں کام جاری رکھے ہوئے ہیں اور سعودی عرب سے رابطے کے لئے جدید ترین ٹیلی کمیونیکیشن ٹیکنالوجی استعمال کر رہے ہیں۔ اپنے ہفتہ وار اعلامئے اور پمفلٹوں کی تقسیم کے علاوہ سی ڈی ایل آر ایس کی فیکس مشینیں سعودی عرب میں ان کے حامیوں سے شکایات' مسائل اور اطلاعات بھی وصول کرتی ہیں۔

لندن میں ہی اپریل ۱۹۹۴ء میں سی ایل آر کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانی بن لادن' جن سے سعودی عرب کی شہریت چھین لی گئی ہے' ایک سخت گیر اسلامسٹ کے طور پر مشہور ہیں۔ بن لادن یمن' افغانستان اور الجزائر میں اسلامی تحریکوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سی اے آر ایک ہمہ جہتی اسلامی تنظیم ہے' جو زندگی کے ہر شعبہ میں مذہبی پروگرام کے نفاذ کے لئے کام کر رہی ہے۔

> "اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ "جائز انسانی حقوق" کے بارے میں اس کی تفہیم کا ماخذ اسلام ہے نہ کہ رواں اصطلاحات' جو انسانی ترقی کے مغربی تصورات میں اس وقت مستعمل ہیں"

اسلامی مملکت میں ایک اسلامی اپوزیشن کیوں؟

سعودی اسلامی اپوزیشن کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلی اور اہم بات جنگ خلیج کے اقتصادی اور سیاسی اثرات' سعودی مملکت کی خصوصیات اور معاشرے کے ساتھ اس کے تعلق کے جائزے کی ضرورت ہے اور اس حقیقت پر نظر ڈالنے کی بھی کہ تعلیمی نظام بالخصوص مذہبی تعلیم میں توسیع اور اقتصادی مواقع میں اضافے کے درمیان مطابقت پیدا نہیں ہو سکی۔ سعودی عرب کی مختصر تاریخ میں جنگ غالباً پہلا طوفانی واقعہ ہے' جس نے حکومت کی اقتصادی اور سیاسی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ شہزادہ نائف کے مطابق جنگ خلیج کے مجموعی اخراجات کا تخمینہ ٧٠ بلین ڈالر ہے۔ تیل کی قیمتیں جو ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ۴۰ ڈالر فی بیرل سے ذرا کم تھیں' ۱۹۹۵ء میں تقریباً ۱۵ ڈالر فی بیرل تک پہنچ گئیں۔

مزید برآں آئی ایم ایف کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق سعودی مملکت کے غیر ممالک میں نقد اثاثے' جنہیں وہ ہنگامی ضرورت کے تحت حاصل کر سکتی تھی' ختم ہو گئے ہیں۔ جنگ خلیج سے پہلے سعودی عرب کے محفوظ ذخائر کی مالیت ۱۳۰ بلین ڈالر تھی۔ یہ مالیت گھٹ کر اب تقریباً ۶۴ء۹ بلین ڈالر رہ گئی ہے۔ توقع ہے کہ ۱۹۹۵ء کے بجٹ خسارے کے نتیجے میں اخراجات میں ٦ فیصد تک کٹوتی ہو گی۔

تاہم اخراجات میں کٹوتی شاہی خاندان کے وظائف کی مالیت پر اثرانداز نہیں ہوگی۔ یہ ماہانہ وظائف شاہی خاندان کے افراد کو ملتے ہیں اور ان کی

مالیت کا دارومدار افراد کی خاندان سعود کے ساتھ نسبی قربت' سنیارٹی اور ازدواجی سٹیٹس پر ہے۔ کئی بجٹ خساروں کے باوجود مذکورہ وظائف میں اضافے کا رجحان جاری ہے اور انہیں ایک غیر سرکاری نظام کے توسط سے تقویت بہم پہنچائی جا رہی ہے۔ اس میں فنڈ کے ضرورت مند افراد کے لئے سرکاری محکموں کے ساتھ بڑے سودے طے کرنے کا اہتمام ہے۔ اس طرح شہزادوں کے لئے ماہانہ وظائف کے ساتھ کمیشن کی اضافی آمدنی فراہم کی گئی ہے۔

> "یہ سوال اپنی جگہ برقرار ہے کہ کسی اور نظریے کے مقابلے میں اسلام کسی ایسی بددل آبادی کے لئے زیادہ باعث کشش کیوں ہے' جو تضاد کا شکار ہو"

سیاسی سطح پر جنگ خلیج نے برسراقتدار گروپ کی قانونی حیثیت کا بحران کھڑا کر دیا ہے۔ جنگ کے نتیجے میں معیشت میں بدانتظامی اور ناکافی دفاعی نظام کے حوالے سے حکومت کے حق حکمرانی کے سلسلے میں سنجیدہ سوالات سامنے آئے ہیں۔ "سرزمین اسلام" کے دفاع کے لئے غیر ملکی افواج کی دعوت سے دو باتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ خاندان سعود کا امریکہ پر انحصار ہے۔ دوسری طرف وہ عمومی خود انحصاری کے حصول میں مکمل طور پر ناکام رہا ہے۔ یہ اخراجات میں کٹوتی کے ساتھ مل کر امور مملکت کے فلاحی نظام اور سماجی خدمات کی فراہمی کے سلسلے کو متاثر کریں گے۔ اس سے "رینٹیر سٹیٹ" جو معاشی نوازشات کے ذریعے بے چینی کا ازالہ کرتی تھی' کے ساتھ افراد کی وفاداری متاثر ہو گی۔ گویا حکومت کو اپنے اقتصادی ہتھیاروں کے بغیر اب اسلامی چیلنج کا سامنا کرنا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے اسلامی اپوزیشن میں اضافے کا تعلق تعلیمی نظام میں توسیع سے بھی ہے۔ بالخصوص اسلامی یونیورسٹیوں میں طلباء کی تعداد میں اضافہ ہے' جو گریجویشن کے بعد اپنے کو بیروزگار پاتے ہیں۔ ماضی میں ایسے بہت سے گریجویٹ سول سروس میں نچلے درجے کی ملازمتوں میں لئے گئے یا انہیں مذہبی اداروں میں بطور امام یا مبلغ بھرتی کیا گیا یا پھر انہیں مذہبی مشن پر بیرون ملک بھیج دیا گیا۔ ان میں سے کچھ اب بیروزگاری کے خلاف ردعمل میں اسلامی اپوزیشن کی حمایت کرتے ہیں۔ اس وعدے کے بدلے میں وہ کسی ایسی حکومت میں اپنی معاشی حالت کو بہتر طور پر سدھار سکیں گے' جو ان کی ضروریات اور مسائل کے بارے میں زیادہ حساس ہو۔

یہ صورتحال کئی لحاظ سے سعودی مملکت کی خود اپنی پیدا کردہ ہے۔ حکومت نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں مذہبی تعلیم کو فروغ دیا۔ اس کی ایک وجہ مذہبی طبقے کے مطالبات تھے اور دوسری وجہ اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ دوسرے مسلم ملکوں میں اپنی برتری قائم کرے۔ ان بیروزگار اعلیٰ توقعات کے حامل یونیورسٹی گریجویٹس کی تعداد میں ملک کی آبادی کے ساتھ مزید اضافے کا امکان ہے۔ ایک اندازے کے مطابق سعودی آبادی کا ۶۰ فیصد ۲۱ سال سے کم عمر افراد پر مشتمل ہے جبکہ ملک کی آبادی میں ۳ء۸ سے ۳ء۹ فیصد سالانہ شرح اضافہ دنیا میں اونچی ترین شرح میں سے ایک ہے۔ شرح آبادی میں یہ اضافہ حقیقی خام قومی پیداوار میں کم تر اضافے سے کہیں زیادہ ہے' جس کا آئی ایم ایف کے مطابق آنے والے سالوں میں سعودی حکومت کو سامنا رہے گا۔ حقیقت میں سعودی عرب کی خام قومی پیداوار میں ۱۹۹۴ء میں ۳ فیصد کمی ہوئی جبکہ ۱۹۹۵ء میں اس میں صرف ایک فیصد اضافے کا امکان ہے۔

تاہم یہ سوال اپنی جگہ برقرار ہے کہ کسی اور نظریے کے مقابلے میں اسلام کسی ایسی بددل آبادی کے لئے زیادہ باعث کشش کیوں ہے' جو تضاد کا شکار ہو۔ جس کے پاس ایک طرف دنیا کی امیر ترین ریاست کی شہریت ہو' جبکہ دوسری طرف اسے مشکلات سے دوچار معاشی حالات کی ناآسودگیوں کو قبول کرنا پڑ رہا ہو۔ اس سوال کا جواب ملک کے کمزور سیاسی تجربے اور متبادل ترقی یافتہ سیاسی نظریات کے فقدان میں ہے۔ بڑے رقبے کے باوجود سعودی عرب چھوٹی آبادی کا حامل ملک ہے' جسے گزشتہ ۶۰ برس سے یہ بات ماننے پر آمادہ رکھا گیا ہے کہ شاہی مجلس (کونسل) وہ شعبہ ہے' جس میں سیاسی امور کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے اور یہ کہ سیاسی امور کا تعین شاہ اور اس کی رعایا کے درمیان رابطے اور مشاورت سے ہوتا ہے۔ یہ صورتحال اور اس کے ساتھ سیاسی آراء اور تنقید کے دیگر شعبوں کا فقدان اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ مساجد اور مذہبی یونیورسٹیوں کے ہاں سیاسی سرگرم کاروں کو کیوں تیار شدہ سامعین مہیا کر رہے ہیں۔

مزید برآں یہ مساجد اور مذہبی یونیورسٹیاں ہی ہیں' جہاں اسلامی سیاسی نظریات' جن کا تعلق ریاست اور اس کی قانونی حیثیت سے ہے' زیر بحث آتے ہیں۔ ان کی تعبیر نو کی جاتی ہے اور انہیں آگے منتقل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس میں تعجب کی بات نہیں ہے کہ اسلامی اپوزیشن ایسے شعبوں میں اپنا بیج بوتی ہے' جنہیں ریاست براہ راست اور موثر طور پر اپنے کنٹرول میں نہیں لا سکتی۔ مداخلت بے جا کے بغیر سعودی حکومت کے لئے ان شعبوں کا کنٹرول اور مانیٹرنگ مشکل ترین اہداف میں سے ایک ہے' جس کا اسے ۱۹۹۰ء کی دہائی سے سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

اپوزیشن چاہتی کیا ہے؟

سی ڈی ایل آر اور سی اے آر کا قیام اپوزیشن کے طریقہ کار میں تبدیلی کی علامت ہے اور اس شعور کی بھی کہ ان کے اسلامی پروگرام کے لئے ایک چھاتا تنظیم کی ضرورت ہے۔ اپوزیشن عرض داشت کے طریقے سے اب مزید مطمئن نہیں ہے کیونکہ حکومت اس میں ملوث افراد کو آسانی سے سزا دے سکتی ہے۔ انہیں تنگ کر سکتی ہے اور نوکری سے محروم کر سکتی ہے۔ اب اسلامی اپوزیشن ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے' جہاں اس کے ممبران کے لئے ملک کے اندر کام کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اپوزیشن اب زیادہ منظم ہے۔ اس میں مطلوبہ اصلاحات کی تفصیلات بھی پائی جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ملک کے اندر گروپوں کے باہمی روابط میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

سی ڈی ایل آر کے سیاسی پروگرام کی نوعیت کیا ہے؟ اس کے مختلف اعلامیوں اور پمفلٹوں کا مطالعہ کیا جائے اور مغربی اور عرب ذرائع ابلاغ میں اس کے شائع ہونے والے مختلف انٹرویوز پر نظر ڈالی جائے' تو اس کی متعدد خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

اپنے تعارفی خط میں' جس میں سی ڈی ایل آر کے لندن میں قیام کا اعلان کیا گیا تھا' کمیٹی نے اپنے مقصد اور کام کے دوہرے امیج کو اجاگر کیا ہے۔ پہلا امیج تنظیم کو انسانیت نواز تنظیموں کے دھڑے سے وابستہ کرتا ہے۔ جبکہ دوسرا امیج اسلام کا ہے' جو اس کے تمام اقدامات اور محرکات کا دائرہ کار خیال کیا جاتا ہے۔ پمفلٹ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ "جائز انسانی حقوق" کے بارے میں اس کی تفہیم کا ماخذ اسلام ہے نہ کہ رواں اصطلاحات' جو انسانی ترقی کے مغربی تصورات میں اس وقت مستعمل ہیں۔ تاہم سی

ڈی ایل آر اپنے بیان میں متبادل تصورات کا براہ راست تعین نہیں کرتی۔ اس کے خیال میں ان کا تعین کرنا "اہل علم حضرات" کا کام ہے۔ اس سے اس کی مراد علماء کے کردار سے ہے۔ پھر بھی سی ڈی ایل آر اپنے آپ کو اپنے نام کی مناسبت سے ایک ایسی تنظیم کے طور پر پیش کرتی ہے' جو "افراد کے جائز حقوق" کی علمبردار ہے۔ جب اس سے وضاحت کے لئے کہا جاتا ہے کہ آیا اس میں مغرب میں سمجھے جانے والے "انسانی حقوق" شامل ہیں۔ جیسے مذہب کی آزادی اور عورتوں کے حقوق وغیرہ' تو سی ڈی ایل آر کا جواب ہوتا ہے' "انفرادی حقوق کا احترام' جن کا شریعت میں تعین کیا گیا ہے"۔

ایک اور اعلامیہ میں کمیٹی نے واضح کیا کہ "وہ ایک سیاسی جماعت نہیں ہے جیسے کہ میڈیا میں اس کا پراپیگنڈہ کیا گیا ہے اور نہ اس کے کوئی سیاسی عزائم ہیں۔ تنظیم کا یہ موقف اسے سیاسی رویئے کے سیکولر تناظر سے دور رکھتا ہے۔ مزید برآں اس کا کہنا یہ ہے کہ گرفتاریوں' انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور تشدد جیسے جن امور کو اس نے اٹھایا ہے' انہیں نظام عدل' عدالتوں اور مجلس شکایات کے امور میں مداخلت تصور نہ کیا جائے۔ ایسے بیانات تنظیم کے لئے ایک خاص طرز کے اقدام کا تعین کرتے ہیں' جس کی جڑیں اس تفہیم میں موجود ہیں کہ اسلام میں کس بات کی اجازت ہے' کیا ممکن ہے اور کیا تجویز کیا گیا ہے۔

اگرچہ سی ڈی ایل آر کا موقف ہے کہ اس کی تنظیم محض اسلامی "انسانیت نواز" تنظیم ہے' اس کے جاری کردہ بیانات کو سیاسی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم شاہی خاندان کے بارے میں اس کے موقف کا جائزہ لیتے ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو میں سی ڈی ایل آر کے ترجمان مصری نے واضح کیا ہے کہ "خاندان سعود (کے ممبران" عظیم الجثہ جانوروں (Dinosaurs) کی طرح ہیں۔ انہیں ختم ہو جانا چاہئے۔ حکومت بادشاہت ہے' مملکت ہے' خاندان ہے' مافیا ہے"۔ اسی طرح کمیٹی کے ڈائریکٹر نقیبہ کا اصرار ہے کہ "اسلامی ریاست کے راہنما کا انتخاب ہونا چاہئے اور اسے جواب دہ ہونا چاہئے"۔ جبکہ آل سعود اس زمرے میں نہیں آتے۔

کمیٹی کے اختیار کردہ راستے کا ایک اور پہلو اس کا انقلاب کی بجائے اصلاحات کی زبان کا استعمال ہے۔ اپنے پروگرام میں سی ڈی ایل آر ایک آزاد عدلیہ کے قیام اور سیاسی شراکت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگرچہ ان باتوں کو خالصتاً اسلامی نقطہ نظر سے زیر بحث لایا جاتا ہے' لیکن جس طرح ان نظریات کو ترتیب دیا جاتا ہے اور انہیں متعارف کرایا جاتا ہے' اس سے جدید سیاسی اظہار میں اپوزیشن کے استغراق اور واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ مزید برآں یہ فورم سعودی اسلامسٹوں اور دیگر علاقائی اور بین الاقوامی تنظیموں جن کا تعلق انسانی حقوق کے اسی قسم کے مسائل سے ہے' کے درمیان اطلاعات اور نکات کو کھولنے میں معاون بنتا ہے۔

سعودی اسلامی اپوزیشن اپنے خطبات میں ماضی کے کئی موضوعات میں تبدیلی کی پرزور حمایت کرتی ہے۔ مثال کے طور پر تنظیم کے ایک حامی کا نعرہ ہے' کہ "غسل' بچے کی پیدائش اور پانی کی عدم موجودگی کی صورت میں پاؤں کی طہارت" جیسے مسائل سے اب آگے بڑھا جائے۔ یہ نعرہ فقہی تفصیلات کے ساتھ شغف کا ردعمل ہے' جن کا سکول کی مذہبی تعلیم اور ہدایات میں غلبہ ہوتا ہے اور جن پر اعلیٰ مذہبی تعلیمی اداروں کے مراکز میں بحثیں رہتی ہیں۔ اس مشغولیت سے فراغت کے خواہش مند حضرات سیاست میں مذہب کو از سر نو متعارف کروانا چاہتے ہیں اور مملکت اور مذہب کے درمیان موجودہ مطابقت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ بالخصوص ریاست کی طرف سے مذہبی طبقے کی تہدید۔

حالیہ تاریخ کے تمام تر عرصے میں مملکت سعودیہ نے مذہب کے کردار کو محدود رکھا۔ مذہب لوگوں کے لئے فقہی مسائل جیسے نماز اور وضو وغیرہ کی تعلیم کا ذریعہ رہا۔ اگرچہ قانونی لحاظ سے مذہب اور سیاست میں کوئی تفریق موجود نہیں' تاہم حکومت اور مذہبی حکام کے درمیان کام کی حقیقی تقسیم کے باعث الگ الگ حلقہ اثر پایا جاتا ہے۔ برسراقتدار گروہ ملک کے سیاسی امور کو چلاتا ہے' جبکہ علماء معاشرے کی روحانی فلاح کا خیال رکھتے ہیں۔ اس پس منظر میں اپوزیشن مذہب کی حیثیت کو دوبارہ بحال کرنا چاہتی ہے' جو اس کے خیال میں ریاستی سیاست کا ایک اہم میدان ہے۔

تاہم سعودی اسلامسٹوں کی اپنی حدود ہیں۔ بڑے پیمانے پر عوام کو متاثر کرنے کے لئے یہ واضح نہیں ہے کہ آیا وہ اپنی نمائندگی کے مسئلے پر قابو پا سکیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تحریک سعودی معاشرے کے ذیلی سیکشن' یعنی متوسط شہری حلقے' نچلے درجے کے ملازمین اور بیوروکریٹس اور نوجوان علماء اور سرگرم کاروں کے ایک گروپ میں مضبوط ہے۔ ملک کے دیگر بااثر گروہ جن کا سیاست میں تاریخی اثر و نفوذ رہا ہے اور تعلیم یافتہ اہل ثروت ایلیٹ ہے۔ پھر پیشہ ور افراد جو جدیدیت کے حالیہ عمل میں اہمیت کے حامل ہیں' ان دو گروپوں اور اسلامسٹوں کے درمیان ایک باضابطہ تنظیمی دائرہ کار جس کے ذریعے ان میں دلچسپی کا اظہار ہو پاتا' موجود نہیں ہے۔ روایتی قبائلی راہنما اور اہل ثروت ایلیٹ گروپ ریاست کے سلسلے میں زیادہ سودمند پوزیشن میں ہیں۔

موخر الذکر تاریخی لحاظ سے کبھی کمزور حیثیت میں نہیں رہے۔ کیونکہ مختلف اوقات میں ان کے مفادات ریاست کے مفادات کے ساتھ ہم آہنگ رہے ہیں۔ جہاں تک دولت مند پیشہ ور اشرافیہ کا تعلق ہے' ان کی خوشحالی کا دارومدار ریاست پر رہا ہے۔ جب تک ریاست ان کے مفادات کو نظرانداز نہیں کرتی' اس کا امکان نہیں ہے کہ وہ اسلامی اپوزیشن کا ساتھ دیں۔ اسی طرح روایتی قبائلی قیادت کو ریاست کے ساتھ وفاداری کے بدلے میں ایک جامع امدادی نظام کے ذریعے نوازا جاتا رہا ہے۔ اس کے سٹیٹس کو تسلیم کیا جاتا ہے اور شاہی خاندان کے ساتھ رشتے ناطوں کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔ حکومت کے ساتھ وفاداری کی تبدیلی کا تب تک کوئی امکان نہیں' جب تک ریاست کے ساتھ اس کے تعلق کی بنیاد مجروح نہیں ہوتی۔

اس میں حیرت کی بات نہیں کہ اسلامسٹ سعودی معاشرے میں ایک نئے ابھرنے والے طبقے میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب رہے۔ یعنی شہروں کے مفلوک الحال باسی' جن میں ملک اور بیرون ملک تعلیم کے نتیجے میں یہ توقعات ابھریں کہ وہ نہ صرف دولت میں حصہ وصول کریں گے' بلکہ انہیں وہ سٹیٹس بھی حاصل ہو گا' جو انہیں موجودہ مقامی سماجی حفظ مراتب میں حاصل نہیں۔

فیکس سے جوہری اشتقاق تک

یہاں علاقائیت کا مسئلہ بھی ہے۔ اسلامسٹوں کا

> "موجودہ صورتحال کو جو چیز ۱۹ ویں صدی کی صورتحال سے ممیز کرتی ہے' وہ یہ ہے کہ معاملات اونچے داؤ پر لگے ہوئے ہیں اور ذرائع بہت زیادہ پرتشدد ہو سکتے ہیں"

زیادہ تر تعلق وسطی صوبے کی آبادی سے ہے' جو نجد سے بالعموم اور قاسم سے بالخصوص تعلق رکھتی ہے۔ انیسویں صدی میں قاسم طاقت کے دو علاقائی مراکز ریاض میں سعودیوں اور ہیل (Hail) میں رشیدیوں میں پھنس کر رہ گیا۔ شہر کے امیر کی وفاداری شمال اور جنوب کی سیاست کے درمیان بدلتی رہی۔ علاقے کی تاجر اور زرعی آبادی کبھی بھی ایک یا دوسرے گروہ کے غلبے سے بچنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ جدید ریاست کی تشکیل کے ساتھ' جسے بھاری بھرکم معاشی وسائل میسر تھے' علاقہ دوسرے صوبوں کی طرح جدیدیت' فلاحی نظام اور تعلیم کی توسیع سے پوری طرح مستفید ہوا۔ مزید برآں روایتی قبائلی قیادت اور دولت مند تاجر طبقے کے پہلو میں قاسم نے متوسط طبقے میں اضافے کا مشاہدہ کیا۔ یہ وہ نوجوان شہری گروپ ہے' جس کے پاس معقول معیاری تعلیم ہے۔ اسلامسٹوں نے اپنا پیغام پھیلانے کے لئے اسی ابھرتے متوسط طبقے کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔ تاہم یہ واضح نہیں ہے کہ تحریک ان علاقائی رکاوٹوں کو توڑنے میں کامیاب رہے گی' جنہوں نے ملک کو تقسیم کر رکھا ہے۔ مثال کے طور پر حجاز اور غالب شیعہ آبادی کا مشرقی صوبہ موجودہ اسلامی سرگرم کاروں سے ایک فاصلے پر ہے' جو کہ وہابی ازم سے متاثر ہیں۔ آج کے اسلام ازم کی دینیاتی جڑیں اسلام کی دیگر تعبیرات سے ٹکراتی ہیں۔ بالخصوص حجازی ورثن اور اس سے کہیں زیادہ شیعہ ڈاکٹرین سے۔

بہت سے حجازیوں اور شیعوں کے نزدیک موجودہ اسلامسٹ انہیں ابتدائی دور کے اخوانوں کے جوش اور ولولے کی یاد دلاتے ہیں' جنہوں نے سعودی عرب کے بانی ابن سعود کے زیر قیادت وہابی ازم کے پھیلاؤ اور عقیدے کو بدعات سے پاک کرنے کی آڑ میں ان پر سنگین مظالم توڑے۔ یہ دیکھنا باقی ہے کہ آیا نجدی اسلامسٹ مذہبی بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان علاقوں کے خوف کو دور کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بات ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئی اور اس سمت میں پیش رفت کا کوئی اشارہ بھی ابھی نہیں ملتا۔

ریاست علاقائیت کے مسئلے اور صدیوں میں پھیلی متوازی مذہبی روایات سے بھی آگاہ ہے۔ احتیاطی کارروائی کے طور پر سعودی حکومت نے جنگ خلیج کے فوراً بعد لندن میں سرگرم عمل شیعہ اپوزیشن تنظیم کے ساتھ مصالحت کا اہتمام کیا' تاکہ شیعہ قیادت اور اسلامسٹوں کے درمیان تعاون کے امکان کو روکا جا سکے۔ تازہ اطلاعات کے مطابق حکومت نے حجازی اسلام کی سرگرمیوں پر پابندی نرم کی ہے۔ اس کے لئے حجازی مبلغ شیخ علوی المالکی' جو کہ صوفی ازم کے فروغ کے لئے معروف ہیں اور جنہیں اس سے پہلے تبلیغ کی اجازت نہیں تھی' اپنی مذہبی سرگرمیاں چلا سکتے ہیں۔

اسلامسٹ جبکہ نمائندگی اور علاقائیت کے مسائل سے دوچار ہیں' ان کی قوت کا ماخذ عوامیت ہے' جو سعودی عرب میں غیر معروف ہے۔ اس میں سب پر مستزاد یہ ہے کہ تحریک نئے ابھرنے والے گروپوں میں فرسٹریشن کی لہروں کو جذب کرتی ہے۔ اس کے لئے وہ انہیں سیاسی موضوعات پر بحث ومباحث کا موقع فراہم کرتی ہے۔ ان کی بے چینی کے اظہار اور ریاست کے بارے میں ان کی مخالفت کو واضح صورت میں سامنے لاتی ہے۔ مساجد اور یونیورسٹیوں کے لیکچر ہال آراء کے اظہار اور اہم سیاسی' سماجی اور اقتصادی مسائل پر بحث کے لئے مناسب ذرائع کے فقدان کے باعث سرگرم عمل اسلامسٹوں اور ان کے حامیوں کے لئے فورم میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اسلامسٹوں کی طرف سے ان شعبوں کے استعمال کے جواب میں حکومت کی طرف سے بڑھتے ہوئے کنٹرول نے اپوزیشن کو مجبور کیا ہے کہ وہ فیکس مشینوں سے مسلح ہو کر غیر ممالک میں کام کریں۔

اس موقع پر جس سوال کے پوچھے جانے کی ضرورت ہے' وہ یہ ہے' کہ آیا سعودی اسلامسٹ جدیدیت کے رجحان کو واپس موڑ سکتے ہیں اور کیا وہ وہابی ازم کی تعلیمات کے مطابق ایک خالص اسلامی معاشرہ قائم کر سکتے ہیں؟ اپنے پیغامات کی ترسیل کے لئے فیکس مشین کا استعمال اور اس کے ذریعے اپنے حامیوں کے ساتھ رابطہ اسی جدیدیت کی پیداوار ہے۔ کیا سعودی معاشرہ ۲۱ ویں صدی میں فیکس مشین کے بغیر داخل ہو سکتا ہے' جو اسلامسٹوں کی رائے میں آنے والے انقلاب کا ایک ذریعہ ہے؟ کیا اسلامسٹوں کی کامیابی جوہری اشتقاق کے پرانے میکنزم کا احیا ہے' جس کا مطلب خانہ سعود کے لئے علاقائی مقابل فریقوں کے دباؤ کے تحت ریاست کی ٹوٹ پھوٹ ہے؟

نمائندگی اور علاقائیت کی سطح پر اسلامسٹوں کی حدود کے پیش نظر کوئی سنجیدہ کارروائی' جو وہ مستقبل میں انجام دے سکتے ہیں' سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ علاقائیت کی طرف واپسی ایک امکان کے طور پر خارج از امکان نہیں ہے۔ علاقائی شناختوں' روایتی علاقائی وفاداریوں اور متبادل مذہبی روایات کا احیا وغیرہ مذکورہ خدشے کی تقویت اور اس کی حوصلہ افزائی کا باعث بنتے ہیں۔ موجودہ صورتحال کو جو چیز ۱۹ ویں صدی کی صورتحال سے ممیز کرتی ہے' وہ یہ ہے کہ معاملات

جنرل (ر) حمید گل فرماتے ہیں :

میں اپنے ملک کی مڈل کلاس یعنی ڈاکٹرز' انجینئرز' سائنٹسٹ' اکنامسٹ' اساتذہ' ادیب' صحافی' دانشور' وکلاء' تاجر اور ان کی تنظیمیں جن کی تعداد بتیس کے قریب بنتی ہے کو ایک معلومات میں شریک کرنا چاہتا ہوں کہ امریکہ دنیا کی کل آبادی کا چار فیصد ہے اور وہ دنیا کے تیس فیصد وسائل پر قابض ہونے کے باوجود نامطمئن ہے۔ جاپان' جرمنی' برطانیہ' کینیڈا' اٹلی' فرانس وغیرہ دنیا کی کل آبادی کا تیرہ فیصد بنتے ہیں اور چالیس فیصد وسائل ان کے تصرف میں ہیں۔ پھر بھی مزید کے لئے ان کی جدوجہد جاری ہے اب بقیہ تیس فیصد وسائل پر دنیا کی تراسی فیصد آبادی کا گزارہ ہے جس میں سے دیگر ترقی پذیر و نیم ترقی پذیر ممالک اور مڈل ایسٹ بھی اپنے حصے سے زیادہ لے جاتے ہیں۔ آپ تیسری دنیا کی فلاشی کا اندازہ خود لگا لیجئے تو میں ان سب محترمین اور ان کی منظم تنظیموں سے اپیل کروں گا کہ آپ لوگ اپنی ذمہ داری کا احساس کیجئے اور اپنے ملک کے ہوس پرستوں سے جو تمام وسائل ہڑپ کرنے کے باوجود سیر نہیں ہو رہے اپنے غریب اور بے آسرا عوام کو نجات دلانے کے لئے منظم اور ہم آواز ہو کر میدان میں نکل آیئے وگرنہ۔

ہماری داستان بھی نہ ہو گی داستانوں میں

(بشکریہ : "چہار سو" مئی' جون ۹۶ء)

بیشتر دینی سیاسی رہنماؤں میں فراست کا فقدان نظر آتا ہے

جماعت اسلامی مان بھی جائے تب بھی تنظیم اسلامی کے ساتھ اس کا اتحاد آسان نہیں لگتا

صحافی متفرق نقطہ ہائے نظر کو بالمقابل ضرور لاتا ہے' ان کے حاملین کو بالمقابل بٹھانا اس کا کام نہیں

تحریر: سلیل خان رانجھا

تنظیم اسلامی کے جریدے ماہنامہ "میثاق" میں ایک مضمون بعنوان "مذہبی جماعتوں کا اتحاد تاریخی و نظریاتی تناظر میں" شائع ہوا۔ اس میں فقہی' مسلکی اور کسی اصولی موقف کے حوالے سے دینی قوتوں کی صورتحال کا جائزہ تھا اور ان میں اختلافات کی حقیقت کا احاطہ کیا گیا تھا۔ جائزہ نگار ڈاکٹر اسرار احمد کا کہنا تھا کہ جمعیت علمائے اسلام' جمعیت علمائے پاکستان اور جماعت اسلامی وغیرہ میں اختلافات کی اپنی ایک تاریخ ہے لیکن ان میں تقسیم و تفریق کی وجوہات میں غالب وجہ اصولی نہیں فروعی ہے' شخصی ہے۔ اور یہ کہ ان خطوط پر ان میں یکجائی ممکن ہے۔ مضمون کو ہم نے ماہنامہ "دینی صحافت" (جنوری فروری ۹۶ء) میں دو قسطوں میں شائع کیا اور ڈاکٹر اسرار احمد سے ہماری ملاقات کی بنیاد بنا۔ اس سے پہلے تنظیم اسلامی کے ناظم اعلیٰ عبدالرزاق' شمالی علاقوں کے ناظم شمس الحق اعوان اور تنظیم کے ایک رکن انجینئر محمد نعیم سے گفتگو ہو چکی تھی اور اس میں موضوع زیر بحث ڈاکٹر صاحب کی "آخری پیشکش" تھی کہ "اگر جماعت اسلامی انتخابات سے تائب ہو جائے تو میں اور میری ساری تنظیم اس میں مدغم ہو جائیں گے۔ اپنی سابقہ پیشکش کے مقابلے میں میں نے کچھ مزید کمی کی ہے کہ اگر جماعت اسلامی پچیس برس کے لئے ہی الیکشن سے مجتنب رہنے کا فیصلہ کر لے تو میں اپنی جماعت کو اس میں مدغم کر دوں گا"۔

۱۹۹۳ء کے انتخابات میں دینی جماعتوں کی ہزیمت پر سیکولر قوتوں نے بغلیں بجائی تھیں اور دینی قوتوں نے بغلیں جھانکنے پر اکتفا کیا تھا۔ اپنے اجلاسوں میں انہوں نے اپنی ناکامی کا جائزہ لیا بھی ہو تو منظر عام پر اس کا اظہار بہت کم ہوا۔ چنانچہ کارکنان کی سطح پر دینی قیادت کی خاموش پیروی ہے۔ ہمدردوں کی سطح پر حالت بے خبری' جبکہ عوام کی سطح پر دینی جماعتوں سے لاتعلقی جوں کی توں برقرار ہے۔ بعض دینی جرائد اور قومی اخبارات میں اکا دکا تحریریں چند تجزیہ نگاروں کی سامنے آئیں لیکن اس سے مذہبی جماعتوں میں خود شکستگی کے عوامل کی نشاندہی نہ ہو سکی جو ان کے نظام کے اندر میکنزم کی طرح نصب ہیں۔ وہ رکاوٹ ہیں جو ان کی پرواز فکر اور جرات عمل کی راہ میں کوہ گراں بن کر حائل ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد سے کوئی ہزار اختلاف کرے' باخبر رہنے کے خواہش مند حلقے ان کی اس خوبی کے ضرور معترف ہیں کہ وہ معاملات پر پردہ نہیں ڈالتے۔ ان کی تاویلات نہیں گھڑتے اور واقعات بتانے میں خاص و عام کی تفریق نہیں کرتے۔ چنانچہ ان کی گفتگو جو ان کے جرائد و تحریر میں ڈھل جاتی ہے میں تھکن نہیں ہوتی۔ الجھاؤ نہیں ہوتا اور ان کے نکات سے کوئی سر جوڑ نہ بھی سکے ان کے کھلے ڈلے اظہار پر سر دھننے پر مجبور پاتا ہے۔ ماچھی گوٹھ کا تمام ریکارڈ جماعت اسلامی کے لٹریچر میں نہ بھی ملے ڈاکٹر صاحب کے خیال میں ان کی کتاب "تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب" میں وہ ضرور مل سکتا ہے۔

جماعت اسلامی سے اتحاد کی خواہش ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور جماعت اسلامی کی کمزوری یعنی انتخابی سیاست اس سے دستبرداری ان کی سب سے بڑی خواہش۔ مولانا مودودی کو اپنا استاد اور ان کی فکر کو اپنا رہنما مانتے ہیں۔ اس کے باوجود ان سے "پالیسی اختلاف" کا اقرار کرتے ہیں جو ۵۷-۱۹۵۶ء میں جماعت سے ان کے خروج کا سبب بنا۔ وہ دن اور آج کا دن اس بات پر اصرار برقرار ہے کہ جماعت نے الیکشن میں حصہ لے کر اپنے آپ کو غیر معمولی طور پر سیاسی بنا لیا ہے اور اس طرح وہ ایک غلط موڑ مڑ آئی ہے لہٰذا یہاں سے واپس مڑ کر اسے علمی و فکری اور ذہنی انقلاب کی جدوجہد پر اپنی پوری توجہات کو مرکوز کر دینا چاہئے۔ انتخابات میں شرکت ڈاکٹر اسرار کی اس شرط کی تکرار سے مشروط ہے جس کا مولانا مودودی نے کہیں ۱۹۷۵ء میں اظہار ان الفاظ میں کیا تھا "ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگان ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو"۔

ڈاکٹر اسرار احمد جماعت اسلامی کے روشن پہلو بھی شاکی ہیں اور ان کا کہنا کہ قائدین جماعت ان کی باتوں کو سنجیدہ نہیں لیتے اتحاد و اتفاق کی تجاویز پر کان نہیں دھرتے۔ بالخصوص انتخابی سیاست سے لاتعلقی کی بات سننے کو بھی تیار نہیں ہوتے' ممکن ہے درست ہو یا نہ ہو۔ تاہم ہمیں معاملہ اس سے کہیں پیچیدہ لگتا ہے۔ جماعت اسلامی ان کی بات مان بھی جائے اس کے باوجود تنظیم اسلامی کے ساتھ اس کا اتحاد آسان نہیں لگتا۔ یہ دو چار برس کی بات نہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا جماعت اسلامی سے "اصولی اختلاف" ۴۰ سال پرانا ہے۔ تنظیم اسلامی کی صورت میں ایک علیحدہ جماعت کی بنیاد بنا۔ فکر' لٹریچر اور طریق کار میں تقریباً یکسانیت سہی' اس کے کارکنان میں ایک الگ فکر اور مزاج کو راسخ کر گیا۔ ان کا اعتراف تھا کہ انہوں نے مختلف ادوار میں جماعت کے بارے میں جو زبان استعمال کی وہ کچھ بے لگام ہی تھی۔ جماعت اسلامی کی ان سے الرجی کا باعث بنی۔ کسی طور پر ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی۔ ہم سے ملاقات میں انہیں موہوم سی توقع تھی کہ "دینی صحافت" میں ان کی تحریر کی اشاعت شاید جماعت اسلامی کی قیادت کے ایما پر تھی۔ جبکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ صحافی متفرق نقطہ ہائے نظر کو بالمقابل ضرور لاتا ہے ان کے حاملین کو بالمقابل نہیں بٹھاتا یہ اس کا کام نہیں۔

بالخصوص ڈاکٹر اسرار احمد کے سیاسی بیانات کے باعث' جن میں بے احتیاطی بے حکمتی کی حد تک ہے اور بعض کالم نگاروں اور بعض اخبارات کے شذرات میں "ایک اور خوشہ" کہلاتی ہے۔ ملاقات کے

(باقی صفحہ پر)

اسلام وہ واحد عنصر ہے جو اس علاقے میں اہم کلیدی رول ادا کر سکتا ہے

وسطی ایشیائی ریاستیں تاحال مکمل طور پر روسی اثر و نفوذ سے آزاد نہیں ہو سکی ہیں

چین بھی ترکی پاکستان اور ایران کے ساتھ فائدہ اٹھانے کی دوڑ میں شامل ہو گیا ہے

تحریر : حبیب اللہ شاہد

جبری اتحاد کے بل پر قائم یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلکس (U.S.S.R) کے حصے بخرے ہونے کے بعد ایشیا کے سیاسی اور تجارتی جغرافیے میں انقلاب انگیز تبدیلی رونما ہوئی ہے بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین اس تبدیلی کو مختلف تناظر میں دیکھ رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ قوم پرستی کا نیا عنصر اس علاقے میں قتل و غارت گری اور خونریزی کا باب وا کر دے گا اور مزید کئی نئی ریاستیں وجود میں آئیں گی۔ ان کا خیال ہے کہ افغانستان پاکستان اور ممکنہ طور پر بھارت کئی ریاستوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ اس مفروضے کے برخلاف بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ علاقہ دنیا کے سیاسی عسکری اور تجارتی افق پر ایک نیا سورج بن کر طلوع ہو گا۔

مغربی ماہرین ایشیا کے قلب میں واقع اس نئی جغرافیائی تکون کے لئے "تین ایشیا" کی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں۔ تین ایشیا سے ان کی مراد جنوبی' مغربی اور وسطی ایشیائی ممالک ہیں۔ ان ۱۶ ممالک کی ۱۰۳ ملین کی افرادی قوت' معدنی ذخائر' اوزاں تجارتی راستے اور نہایت وسیع مارکیٹ اپنے اندر ایک نئی اور حیرت ناک دنیا پیدا کرنے کے تمام لوازمات لئے صرف مناسب حکمت عملی کی منتظر ہے۔ مغربی ماہرین کا خیال ہے کہ اس نئی تکون کا سب سے اہم عنصر اسلام ہے اور یہی وہ دین ہے جس کے پیروکار پہاڑوں' دریاؤں اور سمندروں کی حد بندی سے ماوراء ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب ہیں۔ اتنے قریب کہ ایک دوسرے کو اپنا اسلامی بھائی گردانتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اسلام اس علاقے میں لوگوں کی زندگیوں میں ایک عظیم انقلاب برپا کرنے کی تمام خصوصیات لئے پوری طاقت کے ساتھ موجود ہے' اور اس علاقے کے ممالک کو ایک مضبوط اور طاقت ور بلاک میں تبدیل کر سکتا ہے۔ تین ایشیا کی اصطلاح کا استعمال بین الاقوامی سیاسی چالبازوں کے اس امر کی بھونڈی کوشش ہے کہ غیر شعوری طور پر یہاں کے مقامی ماہرین اپنے اپ کو تین علیحدہ وحدتوں میں تقسیم کر لیں حالانکہ یہ سارا علاقہ دینی و ثقافتی لحاظ سے ایک ہی وحدت ہے۔

ایشیا کے اس علاقے کو جسے مغربی ماہرین تین ایشیا کہہ رہے ہیں ہم "سبز ایشیا" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سبز ایشیا میں پوشیدہ ایک زبردست قوت کی راہ روکنے کے لئے عالمی طاقتیں کھل کر میدان میں آ چکی ہیں۔ ان کی ایما پر ذرائع ابلاغ نشاۃ ثانیہ کی اصلاحی تحریکوں کو متشددانہ تحریکیں گردان کر اسلام کو دہشت پسند مذہب کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ متنازعہ سیاسی گروہوں میں خودکار ہتھیار تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ بین الاقوامی تنازعات کو ہوا دی جا رہی ہے۔ پڑوسیوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کیا جا رہا ہے۔ بھارت برما سری لنکا اور شیشان میں مسلمانوں کی نسل کشی کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ افغانستان میں ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ یہ ملک طویل عرصے تک خانہ جنگی کا شکار بنا رہے تاکہ اس کی ساری ذمہ داری ملا پر ڈال کر بنیاد پرستوں کا بستر گول کیا جا سکے۔ افغانستان میں حالات دگرگوں بنا کر پاکستان کو' جو اس علاقے میں ایک اہم ملک ہے' وسطی ایشیا سے کاٹنے کے لئے اسپیچ بنا دیا گیا ہے۔

اگر ہم سبز ایشیائی ممالک پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو ایسا محسوس ہو گا کہ عدم استحکام اور اقتصادی بدحالی ایک مشترکہ مسئلہ بن کر ان ممالک کو بتدریج معاشی غلامی کی جانب کھینچ رہے ہیں۔ وسطی ایشیائی ریاستیں تاحال مکمل طور پر روسی اثر و نفوذ سے آزاد نہیں ہو سکی ہیں۔ مغربی ایشیا خصوصاً افغانستان کی خانہ جنگی نے اس علاقے کی ترقی و خوشحالی پر نہایت برے اثرات مرتب کئے ہیں۔ ادھر کردوں کے مسئلے پر ترکی اور جنوبی ایشیا میں پاکستان و بھارت کے مابین تنازعہ کشمیر ایک لاینحل مسئلہ بن کر عوام کی خوشحالی کی راہ میں سنگ راہ بن کر استادہ ہیں۔

حالات بہرحال کتنے ہی ناموافق کیوں نہ ہوں اسلام بہرحال وہ واحد عنصر ہے جو اس علاقے میں ایک مشترک نظریہ حیات ہونے کے باعث نہ صرف علاقائی تنازعات میں اہم کلیدی رول ادا کر سکتا ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی مغربی اجارہ داری کو چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وسطی ایشیائی ریاستوں کی آزادی کے باعث اس علاقے کو عسکری لحاظ سے بھی نہایت اہم حیثیت عطا ہو گئی ہے۔ یہاں کے ممالک کے خلاف یورپی مفادات کو تحفظ دینے کی آڑ میں اقوام متحدہ کے ذریعے لگائی جانے والی تجارتی پابندیاں بھی اتنی کارگر ثابت نہیں ہو سکتیں جس طرح عراق لیبیا یا سوڈان کے خلاف ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں دو قطبی دور کے خاتمے کے بعد اس علاقے کے ممالک ایک دوسرے کے اور بھی نزدیک آ سکتے ہیں۔

اہل نظر اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ سبز ایشیا میں پوشیدہ طاقت کو ابھرنے سے پہلے ہی ختم کر دینے کے لئے ایک نیا اتحاد وجود میں آ چکا ہے۔ واشنگٹن' تل ابیب' ماسکو اور دہلی کے مابین ترکی سے لے کر مالدیپ تک کے وسیع و عریض علاقے میں اسلام اور اسلام پرستوں کے احیا کو روکنے کے لئے اتفاق رائے پیدا کر لیا گیا ہے۔ یہ ممالک اسلام پرستوں کو سبق سکھانے کے لئے بنائی گئی مشترکہ حکمت عملی کو طے کردہ منصوبے کے تحت آگے بڑھا رہے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سیکولر اور سوشلسٹ حکمرانوں کی پشت پناہی کی جا رہی ہے۔ اسلامی اداروں کے مالی امور اور ان سے وابستہ افراد کی سفری منازل پر نگاہ رکھنے کے لئے معلومات کے تبادلے میں اعانت کی جا رہی ہے۔ اپنی اداروں کو جہالت' فرقہ پرستی اور دہشت گردی کے مراکز ظاہر کر کے اسلام کی بیخ کنی کے انتظامات بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ مقامی حکومتوں میں "اپنے آدمیوں" کے ذریعے ایسی پالیسیوں پر اتفاق رائے پیدا کیا جا رہا

ہے جن سے علاقائی تنازعات مزید ابھر کر سامنے آئیں اور ملکوں کے مابین غلط فہمیاں پیدا کر کے تعمیر و ترقی کے راستوں کو حتی المقدور بند کیا جا سکے۔

لیکن اصل بات کہنے کی یہ ہے کہ تعمیر و ترقی کے ضمن میں غیروں سے زیادہ ہماری اپنی غلط پالیسیوں کا عمل دخل بہت زیادہ ہے مثلاً پاکستان کی امریکہ سپردگی کی پالیسی نے چین اور بالخصوص ایران میں غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں جو کافی حد تک بجا ہیں۔ جہاں تک ایران کا تعلق ہے ایرانیوں کی جانب سے اس تاثر کا زیادہ اظہار ہوا ہے کہ یہ انقلاب اپنے مخالفین کے لئے صلہ رحمی کے بجائے بدترین عصبیت اور سزاؤں کا پیامبر ہے۔ پھر ان کی جانب سے ہمسایہ ممالک کی اسلامی تحریکوں سے قریبی تعاون کے بجائے ایک مخصوص گروہ کی پشت پناہی کا تاثر نسبتاً زیادہ واضح طور پر ابھرا ہے۔ چنانچہ سیکولر اور قوم پرست طبقات نے عربوں کی دولت کے بل بوتے پر امریکی حمایت سے اس انقلاب کا راستہ روکنے کے لئے نہ صرف ایران پر جنگ مسلط کی بلکہ ایران کو ایک دہشت گرد ملک کے طور پر بھی باقی دنیا کے لئے خطرناک ملک بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایران اور پاکستان کے مابین افغانستان اور وسطی ایشیائی ریاستوں میں اثر پذیری کے مواقع حاصل کرنے پر بھی واضح اختلافات موجود ہیں۔

چین نہ صرف امریکی اطاعت کی پاکستانی پالیسی پر مضطرب ہے بلکہ پاکستانی سرحد سے ملحقہ صوبوں میں جہاں کی بیشتر آبادی مسلمان ہے اور جہاں بے چینی کے پے در پے واقعات رونما ہوئے ہیں ان واقعات پر پاکستان سے شکایتی لہجے میں سرد مہری کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اسلام آباد کے چینی سفارت خانے نے پاکستانیوں کے چین جانے پر کافی سخت پابندیاں عائد کر دی ہیں اور خبردار کیا ہے کہ سفری دستاویزات کی عدم موجودگی پر پکڑے جانے والے پاکستانیوں کو موت کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔

وسطی ایشیائی ریاستوں بالخصوص کرغستان اور قازقستان کے ساتھ گو چین کے تعلقات سرد مہری کا شکار رہے ہیں لیکن روس اور چین کے مابین سرد جنگ کے خاتمے کے بعد چین اپنی توجہ تجارتی تعلقات کو بہتر بنانے کی جانب کر رہا ہے گویا وسطی ایشیا کو اپنی مصنوعات کی منڈی بنانے کے لئے اور راہداری کی سہولیات دے کر فائدہ اٹھانے کی خاطر جاری کش مکش میں چین بھی ترکی پاکستان اور ایران کے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔

جہاں تک وسطی ایشیائی ریاستوں کا تعلق ہے روس کے غلبے سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف نو آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ کی تنظیم اور اقتصادی تعاون کی تنظیم ECO کو مظبوط بنائیں بلکہ صنعتی ترقی کے لئے یورپ کے بجائے جاپان کوریا اور آسیان ممالک کی جانب رجوع کریں۔ مغربی اور جنوبی ایشیا کے ممالک کے لئے سب سے اہم مسئلہ بھارتی مفادات کو پس پشت رکھتے ہوئے خود مختارانہ پالیسیوں کی عمل پذیری کو ممکن بنانا ہے۔ اگر بھارت پڑوسی ممالک کی آزادی اور خود مختاری کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے آپ کو علاقائی طاقت کے طور پر منوانے کی کوششیں ترک کر دے تو کوئی وجہ نہیں کہ سارک تنظیم کو موثر بنا کر علاقے میں پائی جانے والی غربت' افلاس اور بے گھری کو ختم کر کے ماحول اور صحت کے مسائل کو بھی انتہائی سرعت کے ساتھ حل نہ کیا جا سکے۔

اقتصادی تعاون کی تنظیم ECO' سارک اور وسطی ایشیائی ریاستوں کی دولت مشترکہ کی تنظیمیں مل کر اس علاقے کو بلاشبہ اقتصادی طور پر دنیا کا خوشحال ترین علاقہ بنا سکتی ہیں لیکن اس خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے سبز ایشیا سے تعلق رکھنے والے ممالک اپنے اختلافات کو ختم کر کے بتدریج سیاسی ہم آہنگی کی جانب قدم بڑھائیں۔ امریکہ یورپ اور مشرق بعید سے تعلق رکھنے والی بیشتر غیر حکومتی تنظیمیں NGO(s) جاسوسوں کا کیموفلاج بن چکی ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کے مقابلے میں اسلامی ممالک سے تعلق رکھنے والی NGO(s) کو کام کرنے کے زیادہ مواقع عطا کئے جائیں۔ علاقائی صنعت کو باہمی تجارت اور فنی تبادلے کے ذریعے فروغ دیا جائے۔ شاہراہیں' ریلوے لائنیں اور بحری و فضائی راستے فوری طور پر انقلابی تبدیلی کے طلب گار ہیں۔ ان سہولیات کو بہتر بنا کر یورپی یونین کی طرح عام لوگوں کے لئے سفری مشکلات کو آسان بنایا جائے تاکہ اس علاقے کے لوگ آزادانہ ایک دوسرے سے مل جل سکیں تاہم جرائم پیشہ افراد پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے جس کے لئے لائحہ عمل طے کیا جا سکتا ہے۔ اطلاعاتی و نشریاتی نظام میں بھی انقلاب انگیز تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن اس نظام کو مربوط بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں یورپی خبر رساں ایجنسیوں کی زہر آلود رپورٹنگ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے مسلم ممالک کی غیر حکومتی خبر رساں ایجنسیوں سے استفادہ حاصل کرنے کی جانب پیش قدمی کرنے سے خبر و نظر کی دنیا میں باہمی تبادلہ اطلاعات کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ مراثیوں اور بھانڈوں کی ثقافت کو ترویج دینے کے بجائے ان ممالک میں موجود علم و ہنر سے متعلق پیشہ ور افراد کے وفود کا بڑے پیمانے پر تبادلہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ جامعات اور تحقیقی ادارے سیمینارز اور لیکچرز کا اہتمام کر کے اس ضمن میں نمایاں کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ طبعی سائنسی علوم بالخصوص طبیعات' کیمیا' زراعت اور ارضیاتی و خلائی علوم کی ترویج کے لئے مشترکہ فنڈ کے قیام کا انتظام کر کے اعلیٰ تحقیقی ادارے قائم کئے جائیں۔ معدنیات کو اونے پونے داموں فروخت کرنے کے بجائے انہیں مصنوعات میں تبدیل کر کے فروخت کرنے کی کوشش کی جائے اور دیگر اسلامی ممالک کو بھی راغب کیا جائے کہ وہ اپنی معدنیات کو نہایت ارزاں داموں پر یورپی ممالک کو فروخت کرنے کی بجائے دیگر اسلامی ممالک کو فوقیت دیں یا پھر اپنی مصنوعات میں تبدیل کر کے فروخت کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ سبز ایشیائی ممالک اگر باہمی ربط کو فروغ دیں اور ترقی کے لئے مخلصانہ کوششوں کا آغاز کریں تو ایک دھائی کے اندر اندر نہ صرف اقتصادی خوشحالی ان کا مقدر بن جائے گی بلکہ خود انحصاری کی جانب ان کے بڑھتے ہوئے قدم کرہ ارض پر موجود دیگر اقوام کو بھی ایک نئی جہت عطا کریں گے۔ ایک ایسی جہت جو نہ صرف عالمی غنڈہ گردی' لوٹ مار اور انسانوں پر کئے جانے والے مظالم کو روک سکنے کی اہل ہو گی بلکہ دنیا میں عدل و انصاف عالمگیر اخوت اور رواداری و شائستگی پر مبنی نئے سیاسی و اخلاقی نظام کو بھی متعارف کرا سکے گی۔

بقیہ : عالم اسلام

انحراف آسان نہ ہو گا اس لئے شاید وہ کوئی درمیانی راہ نکالنے کی کوشش کریں۔ لیکن وہ درمیانی راہ کیا ہو گی' اس کے لئے کچھ انتظار کرنا ہو گا۔ مگر ایک بات یقینی ہے کہ نئی تبدیلیوں کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں۔ ان کی صحیح سمت کیا ہو گی کسی ام المحارب (Mother of all Battles) یا ملحمہ العظمیٰ (Armagedan) کے جھگڑ چلیں گے یا پھر امن و شانتی کی بہار بہاری۔ ابھی کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

ڈپٹی کمشنر کے ادارہ میں اتنی سکت نہیں کہ پولیس کا احتساب کر سکے

پاکستانی معاشرے میں کھلم کھلا رشوت نے شہریوں کی زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے

محتسب نہ تو انتظامیہ سے ہوں اور نہ ہی سیاست سے بلکہ عدلیہ سے ہوں

تحریر : ڈاکٹر لیاقت علی نیازی

اسلام میں احتساب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دور نبوت ہی میں نبی اکرم ﷺ نے ایک محکمہ قائم کیا تھا جسے دلائت مظالم کہا جاتا تھا۔ یہ محکمہ ظلم کی روک تھام کرتا۔ نبی اکرمؐ بطور محتسب کے خود اس ادارے میں جلوہ افروز ہوتے تھے۔ دور خلفائے راشدین میں بھی یہ ادارہ قائم رہا۔ اموی اور عباسی دور میں بھی یہ ادارہ اپنا کام بطرز احسن سر انجام دیتا رہا۔ ہندوستان میں بھی ۱۵۵۳ء تک یہ ادارہ کام کرتا رہا۔ بادشاہ دیوان عام میں بیٹھ کر انتظامیہ' عدلیہ اور دیگر حکام کی ناانصافیوں اور عوام کے خلاف شکایات خود سنتا اور فوراً ضروری احکام جاری کرتا۔ تفصیل کے لئے امام الماوردی کی "کتاب الاحکام السلطانیہ" ملاحظہ کی جا سکتی ہے جس میں درج ہے کہ محتسب تجارتی امور میں بھی تجار کا احتساب کرتا۔ سڑکوں کی دیکھ بھال حکیموں اور طبیبوں نیز اساتذہ کا احتساب اس کے ذمے تھا۔ ہندوستان میں کوتوال کا ادارہ بھی محتسب کی ایک قسم تھی۔ ایک اور ادارہ جسے صاحب السوق کہا جاتا تھا نہ صرف تجارتی معاملات بلکہ عوام الناس کی عزت و ناموس مال اور جان کا بھی صحیح محافظ تھا۔ سویڈن میں یہ ادارہ ۱۸۰۹ء میں قائم ہوا۔ پاکستان میں وفاقی محتسب کا ادارہ ۱۹۸۳ء میں قائم ہوا۔

پاکستان میں ہر سطح پر محتسب کی ضرورت ہے چاہے وہ صوبائی ہو' ڈویژنل ہو یا ضلعی سطح ہو۔ اس ضمن میں تجاویز ملاحظہ ہوں۔

(۱) ضلعی محتسب اور پولیس کا احتساب :

بیوروکریسی' ٹیکنو کریسی اور دیگر زدہ کلیرو کریسی نے معاشرے کی بنیادوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں کھلم کھلا رشوت نے شہریوں کی زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے۔ ملازمین کی تنخواہیں اس قدر کم ہیں کہ وہ رشوت لینے پر مجبور ہیں۔ وقت کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ مہنگائی کو کم کیا جائے اور تمام ملازمین کی تنخواہیں معقول ہوں۔ تب صحیح احتساب کا حق بنتا ہے۔ ضلعی سطح پر پولیس کے نظام میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ پولیس کے احتساب کی بھی اشد ضرورت ہے۔ پولیس تشدد اور حبس بے جا میں رکھے جانے کے بے شمار واقعات اور عدم احتساب نے عوام میں عدم تحفظ کا احساس اجاگر کر دیا ہے۔ ضلعی محتسب کو تمام قانونی اختیارات دیئے جائیں کہ وہ پولیس کا احتساب کر سکے۔ ڈپٹی کمشنر کا ادارہ کافی کمزور ہو گیا ہے۔ اس میں اتنی سکت نہیں کہ پولیس کا احتساب کر سکے۔ پولیس کے افسران بالا بھی پولیس کے محکمہ میں ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ نہیں کر پاتے۔ ضلعی محتسب عدلیہ سے ہونا چاہئے۔ اس کا عہدہ سینئر ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے برابر ہو۔

(۲) قانونی اختیار :

پاکستانی معاشرے کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے ضلعی محتسب کو ایسا قانونی اختیار دیا جائے جس سے وہ ضلعی سطح پر ہر محکمہ کا احتساب کر سکے۔ وہ عوام کے اخلاق کو بھی سدھار سکے۔ ہمارے معاشرے پر ثقافتی یلغار نے اخلاق کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ سرعام وڈیو کی دوکانیں جن سے فحش وڈیو کیسٹیں عوام میں زہر پھیلا رہی ہیں اور دیگر مخرب اخلاق لٹریچر اور فحاشی کے تمام امور پر ضرب کاری لگانے کی ضرورت ہے۔

(۳) منشیات کی روک تھام اور دیگر برائیاں :

منشیات کی روک تھام کا کام ضلعی محتسب کے پاس ہونا چاہئے تا کہ معاشرہ اس لعنت سے پاک ہو۔ اس ضمن میں محتسب کے پاس اپنی فورس ہو یا وہ پولیس وغیرہ سے فورس بطور خاص حاصل کرے۔ نیز رشوت کی روک تھام اور عوام الناس کے حقوق کی پامالی کی صورت میں ضلعی محتسب کے پاس مکمل ضابطہ موجود ہو جس کے تحت وہ لوگوں کی گرفت کر سکے۔ خوراک میں ملاوٹ کے مقدمات ضلعی محتسب کے دائرہ کار میں ہونے چاہئے۔ ضلعی محتسب کا اختیار ہو کہ وہ صوبائی اور مرکزی محکمہ جات کا احتساب کر سکے۔ کوئی محکمہ بھی اس سے بچ نہ سکے۔ ناجائز کمائی اور ناجائز دولت کے اکٹھا کرنے پر بھی احتساب کرے۔

(۴) دیہی محتسب کا قیام :

عباسی دور کے بعد ایران میں دیہاتوں میں بھی محتسب مقرر کئے گئے تھے۔ آخر کار رضا شاہ پہلوی نے محتسب کے ان اداروں کو ختم کر دیا تھا۔ ہندوستان میں غیاث الدین بلبن کے دور میں ہر دیہات جس کی آبادی ۲۰۰ سے ۴۰۰ تک تھی وہاں ایک دیہی محتسب قائم کیا گیا تھا۔ تحصیل اور تھانے کی سطح پر بھی محتسب ہونے چاہئیں جو ضلعی محتسب کی مدد کریں۔ حکومت فضول اور بے کار محکموں کو ختم کر کے یا ان کے سٹاف میں کمی کر کے بچت کر سکتی ہے۔ یہ بچت ضلعی محتسب کے ادارے اور اس کے دیگر ماتحت اداروں کے پھلنے پھولنے میں صرف ہو سکتی ہے۔

(۵) اخبارات اور ذرائع ابلاغ سے مدد :

یورپ کے کئی ممالک میں اخبارات کے محتسب' پولیس محتسب اور عدلیہ کے محتسب ہوتے ہیں۔ ہائی کورٹ کے عہدے کا ایک جج اخبارات میں شائع شدہ خبروں کے ذریعے مختلف محکمہ جات کا احتساب کرتا ہے۔ پاکستان میں کئی اخبارات شکایات سیل کے ذریعے عوام الناس کے خلاف ہونے والی زیادتیوں کی نشاندہی کرتے ہیں مگر ان کا ازالہ نہیں ہوتا۔ ضلعی محتسب کو اگر یہ اختیار حاصل ہو تو وہ فی الفور انصاف مہیا کر سکتا ہے۔ ضلعی محتسب کا طریقہ کار انتہائی آسان ہونا چاہئے اور درخواستوں پر کوئی سرکاری فیس بھی نہیں ہونی چاہئے۔ ضلعی محتسب

کے دائرہ اختیار میں حکومت کا ہر شعبہ ہو۔ معاشرے کا کوئی طبقہ بھی اس کی گرفت سے بالاتر نہ ہو۔ اس طرح ہائی کورٹس پر رٹوں کا سلسلہ بھی کم ہوگا اور لوگوں کو انصاف ضلعی سطح پر مل جائے گا۔

پاکستان میں وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ ضلعی سطح پر محتسب قائم ہوں۔ نہ تو وہ انتظامیہ سے ہوں اور نہ ہی سیاست سے تعلق رکھتے ہوں بلکہ عدلیہ سے ہوں۔ اس ادارے کو اسلام کے دیوان مظالم یا ادارۂ مظالم سے ہم آہنگ کر دیا جائے تاکہ ہم ایک ایک متروکہ اسلامی روایت کو زندہ کر سکیں۔OO

بقیہ : مذہب و سیاست

کے لئے' اسلام کی خاطر اپنی جانیں دینے کے لئے تیار ہوں' تقریر و تحریر کے ذریعے نیکی کی تلقین اور برائی سے بچنے کی عوام کو ترغیب دیتے رہنا۔ جب فدائین میسر آ جائیں منکرات خلاف ڈٹ جانا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس مرحلہ پر ہم حکومت کو چیلنج کریں گے کہ ہمیں اقتدار نہیں چاہئے یہ تمہیں مبارک البتہ ہم جیتے جی یہ کام نہیں ہونے دیں گے۔ اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو ان کا گھیراؤ کیا جائے گا' پکیشنگ ہو گی لیکن یہ سب کچھ پرامن ہوگا۔ اس کا دو میں سے ایک نتیجہ برآمد ہوگا۔ یا تو حکومت دباؤ مان لے گی اور برائیوں کا خاتمہ یکے بعد دیگرے شروع ہو جائے گا جس کے نتیجے میں اسلامی انقلاب کی راہ ہموار ہو گی یا حکومت اس جماعت کو کچل دے گی اور اس کے کارکن جام شہادت نوش کر لیں گے۔ ع

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

لیکن عوام اس گروہ میں شامل ہوں تو کیوں۔ یہاں نہ کوئی سیاسی ہنگامہ پروری جس کے نتیجے میں کچھ مراعات حاصل ہو جائیں اور نہ نیکیوں کے پہاڑ کے وعدے۔ بلکہ جان دینے کی بات ہو رہی ہے۔ نصف صدی سے ہم سیاسی مذہبی جماعتوں کے نیم سیاسی نیم مذہبی تماشے بھی دیکھ رہے ہیں۔ اور تبلیغی جماعت کے لاکھوں کے مشتمل اجتماعات بھی۔ لیکن صورتحال یہ ہے کہ ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اب تو عوام کے لئے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو اسلام کو بھول کر کوئی سا ازم بھی اپنا لیں اور اپنی دنیا بنانے میں مست رہیں یا کسی ایسی قیادت کو تلاش کریں جو انہیں اسلام کی منزل پر پہنچا سکے۔ اگر ایسا ہو گیا تو دنیا میں عدل قائم ہوگا اور آخرت میں نجات بھی ملے گی۔ دینی عناصر کے اس تیسرے گروہ کو ملک کی تیسری طاقت بنانے کا عزم پیدا کریں۔ شاید اس کے ذریعہ دین و دنیا کی بھلائی میسر آ جائے۔OO

خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور
پھر آیا چاہتا ہے!

اسے لانے میں اپنی ذمہ داری ادا کرنے کی فکر کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مسترد کر کے خلافت کا علم کسی اور قوم کے ہاتھ میں تھما دے۔

اِنعامی مقابلہ مضمون و نظم نویسی

"ترقی پسند' روشن خیال اور لبرل مسلمان"؟

آج کل کچھ لوگ اپنے آپ کو "ترقی پسند' روشن خیال اور لبرل مسلمان" کے طور پر متعارف کرا رہے ہیں اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عریانی' فحاشی' بے حیائی اور بدکاری کے دلدادہ' جواء اور شراب و شباب کے رسیا' اللہ کے باغی' گمراہ لوگ ہی اپنے آپ کو ترقی پسند' روشن خیال اور لبرل مسلمان کا لقب دے رہے ہیں۔

تحریک اصلاح معاشرہ پاکستان یہ جاننے کے لئے مضمون نویسی اور شاعری کا انعامی مقابلہ منعقد کرا رہی ہے کہ پاکستانی عوام' علماء اور دانشور "ترقی پسند' روشن خیال اور لبرل مسلمان" کن صفات کے حامل افراد کو سمجھتے ہیں؟ پاکستانی عوام' علمائے کرام اور دانشوروں سے گزارش ہے کہ وہ "ترقی پسند' روشن خیال اور لبرل مسلمانوں" کے اخلاق و کردار' مشاغل' عزائم و نظریات اور ان کے لئے دنیا و آخرت میں ممکنہ عذاب کی عکاسی کرنے والے مضامین اور نظمیں بھیج کر اس مقابلے میں شرکت کریں۔

انعامات کی تفصیل

1- پہلے بہترین مضمون پر 5 ہزار روپے نقد اور تعریفی سند۔
2- دوسرے بہترین مضمون پر 3 ہزار روپے نقد اور تعریفی سند۔
3- تیسرے بہترین مضمون پر دو ہزار روپے نقد اور تعریفی سند۔
4- اول' دوم' سوم آنے والی نظموں پر بالترتیب دو ہزار' ڈیڑھ ہزار اور ایک ہزار روپے کے نقد انعام کے ساتھ تعریفی سند دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ہر اچھے مضمون/ نظم پر کتابوں کی صورت میں خصوصی انعام اور تعریفی سند دی جائے گی۔

- مضمون نظم بھیجنے کی آخری تاریخ 30 جون ہے۔
- انعامی مقابلے کے نتائج کا اعلان 25 جولائی کو کر دیا جائے گا۔
- انعامات کے فیصلہ کے سلسلے میں تحریک اصلاح معاشرہ پاکستان کی مقرر کردہ کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا

تحریک اصلاح معاشرہ پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر 6216 لاہور
MOVEMENT FOR REFORMING SOCIETY (PAKISTAN) P. O. BOX - 6216 LAHORE

اسلام ہی دنیا میں عدل اجتماعی کا ضامن ہو سکتا ہے

ملک کی عظیم اکثریت دنیا پرستی میں مبتلا ہے' اسے اسلام سے کوئی سروکار نہیں !

تحریر : م۔س' کراچی

ہر کجا بینی جہان رنگ و بو
زانکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نور مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ است

جہان رنگ و بو میں جہاں کوئی خوبی نظر آتی ہے وہ اسی خاک کی تہہ سے برآمد ہوئی ہے۔ یا تو اس خوبی کا سرچشمہ نور مصطفیٰ ؐ ہے یا دنیا اسی نور مصطفیٰ ؐ کی تلاش میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام بندوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ تعالیٰ کی غلامی میں لے آتا ہے اور یہ غلامی وہ ہے جس پر دنیا کی تمام آزادیوں کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ انسان چونکہ فطری طور پر آزاد پیدا ہوا ہے لہٰذا وہ کسی بندے کی غلامی میں اگر جکڑا بھی جائے تو تادیر وہ اس کیفیت میں نہیں رہ سکتا۔ جب ملوکیت نے انسانوں پر اپنے پنجے گاڑے تو انسان اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے جمہوریت کی پناہ میں آیا۔ لیکن یہاں سرمایہ داری نے اسے اپنے جال میں جکڑ لیا۔ سرمایہ داری سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس نے سوشلزم کی پناہ حاصل کرنی چاہی تو ایک پارٹی ڈکٹیٹر شپ کے پھندے میں پھنس گیا۔ آزادی کی خواہش لئے انسان خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے۔ ہنوز منزل کی طرف پیش قدمی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ انسانوں کے بنائے ہوئے نظام کی طرف لپکتا ہے۔ کوئی انسان خواہ کتنا ہی پر خلوص کیوں نہ ہو' ایسا نظام وضع نہیں کر سکتا جو اللہ کے تمام بندوں کو عدل مہیا کر سکے۔ بادشاہ اگر قانون بنائے گا تو اسے ان جاگیرداروں کے مفادات کو سامنے رکھنا پڑے گا جو اس کی ملوکیت کی گاڑی کو کھینچ رہے ہیں۔ لامحالہ ہاریوں کو عدل نہیں ملے گا۔ سرمایہ دار قانون بنائے گا تو وہ اپنے مفادات کو محنت کشوں کے مفادات پر ترجیح دینے پر مجبور ہو گا۔ یہی حال مرد کا ہے کہ جب اسے قانون سازی کا موقع ملے گا تو وہ عورت کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے گا یا اسے برعکس معاملہ ہو گا اگر عورت قانون ساز بن جائے۔ دنیا میں ایک ہی ہستی ایسی ہے جو ہر ایک کی ضروریات کو سب سے زیادہ جاننے والی ہے اور اس کا ہر ایک سے رشتہ ہے۔ پھر اسے کسی قسم کی کوئی احتیاج نہیں۔ اور وہ ذات ہے اللہ سبحانہ تعالیٰ کی۔ اس کا وضع کردہ نظام ہی دنیا کی تمام مخلوقات کے لئے عدل کا ضامن بن سکتا ہے۔ ہماری خوش قسمتی یہ کہ اس نے یہ نظام' دین اسلام ہمیں دیا ہے تاکہ اسے دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کرنے کی جدوجہد کریں۔ اسی جدوجہد کے ذریعے سرزمین عرب کی حد تک اسلام کو غالب کر کے دکھا دیا۔ ان کے بعد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس نظام کو وسعت دے کر افریقہ یورپ اور صنم خانہ ہند تک پہنچا دیا لیکن افسوس کہ آج ہماری مثال اس سانپ کی ہے جو کسی خزانے پر کنڈلی مارے بیٹھا ہو نہ خود اس سے کوئی فائدہ اٹھا رہا ہو اور نہ اقوام عالم کو فائدہ اٹھانے کا موقع دینے کو تیار ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ ساٹھ سے زیادہ مسلم ممالک دنیا میں موجود ہیں جن کے حکمراں اپنے ملک کے انتظام کو چلانے کے لئے کبھی سوشلزم کی طرف بھاگتے ہیں تو کبھی سیکولرزم کی طرف' کبھی جمہوریت کے ترانے الاپتے ہیں تو کبھی ملوکیت کے گن گانے لگتے ہیں۔ مسلم عوام کی بڑی تمنا ہے کہ اس خزانے سے فائدہ اٹھائیں جسے اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کیا ہے۔ اس کے لئے وہ سب سے زیادہ توقع دینی عناصر سے رکھتے ہیں اور ان کی بڑی آرزو ہے کہ یہ سارے عناصر ایک ہو جائیں لیکن ع
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

علماء دین میں جو اپنے دارالعلوموں میں درس و تدریس کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ دنیا کسی سمت میں آگے بڑھ رہی ہے نہ وہ جانتے ہیں اور نہ جاننے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں ع اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ جو ان کے پاس چل کر آ گیا اسے تو سکھا دیا جو کچھ بھی سکھا دیا۔ دین کم اور مسلک و مذہب زیادہ محبتیں کم اور نفرتیں زیادہ۔ باقی عوام کو دین بتانے کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتے ہیں۔ مذہبی سیاسی جماعتیں ہیں جو بیشتر مسالک و مذاہب کی بنیاد پر قائم ہیں۔ یہ سب اکثر و بیشتر الگ الگ الیکشن لڑتی ہیں۔ دیوبندی' دیوبندی جماعت کو ووٹ دیتا ہے۔ بریلوی' بریلوی جماعت کو' شیعہ شیعہ جماعت کو اور اہلحدیث اہلحدیث جماعت کو۔ اول تو دین کی بنیاد پر ووٹ دینے والے ہی کتنے ہیں۔ ملک کی عظیم اکثریت تو دنیا پرستی میں مبتلا ہے اور اپنے مفادات کے حصول کا ذریعہ ان سیاسی رہنماؤں کو سمجھتی ہے جن کی بے اصولی ہی ان کا اصول ہے۔ اور ایسے ہی لوگ عوام کی "خدمت" کر سکتے ہیں۔ باقی اسلام کے نام پر پڑنے والے ووٹ بٹ جاتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں کوئی جماعت ایک سیٹ لئے بیٹھی ہے کسی کے پاس تین سیٹیں تو کسی کے پاس اللہ اللہ خیر صلا۔ یہ پارلیمنٹ کے اندر بھی اکٹھے ہونے کو تیار نہیں۔ کوئی حکومت کے ساتھ ملا ہوا ہے تو کوئی حکومت مخالف ہے۔ اور دعویٰ ہے نظام کو بدلنے کا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ چراغ سے چراغ جلائے جاؤ روشنی پھیلتی جائے گی اور تاریکی خود بخود کافور ہو جائے گی۔ میر انیس نے کہا تھا کہ ع انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جانا۔ چراغ لے کہاں سامنے ہوا کے چلے۔ لیکن انہیں مخالف ہواؤں کی تیزی کا کوئی شعور ہی نہیں لہٰذا جہاد کے مراحل ان کی زندگیوں میں شاذ و نادر آتے ہیں۔ نفس کے خلاف جہاد تو شاید پھر بھی کچھ لوگ کر لیتے ہوں لیکن معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کے خلاف جہاد۔ کہتے ہیں کہ اگر ہم ایسا کرنے لگے تو یہ لاکھوں کا مجمع کہاں رہے گا۔ اور نظام کے خلاف جہاد تو ان کی لغت میں ہے ہی نہیں۔ ہاں البتہ ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو یہ کہتا ہے کہ اسلام نہ تو محض تبلیغ سے آئے گا اور نہ ہی انتخابات کے راستے سے بلکہ اس کے لئے تو نبوی ؐ انقلاب کے نقش قدم پر چلنا ہو گا۔ دعوت۔ دعوت قبول کرنے والوں کی تنظیم' ان کی تربیت جب تک ایک معتدبہ تعداد ایسے فدائین کی دستیاب نہ ہو جو صرف اور صرف اللہ کی خاطر نہ کہ کسی دنیوی غرض

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

مکتوب کراچی

بڑے سے بڑا مجرم اپنی قیمت ادا کر کے پولیس کی گرفت سے نکل جاتا ہے

حکمران اگر کرپٹ ہو جائیں تو عوام کو ان کی پیروی کرنے میں دیر نہیں لگتی

معاشرے سے یہ تصور معدوم ہو گیا ہے کہ ہر آدمی کے کندھوں پر دو فرشتے موجود ہیں جو نیک و بد اعمال مرتب کر رہے ہیں

تحریر : نجیب صدیقی، کراچی

کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے اپنی رعایا میں دیانت کا تناسب معلوم کرنا چاہا تو اپنے دانا وزیر سے مشورہ کیا۔ وزیر نے کہا کہ آپ اعلان کر دیجئے کہ ہر شخص ایک بالٹی دودھ ایک متعین حوض میں ڈال دے جو ہر طرف سے ڈھکا ہوا تھا اور یہ دودھ رات کے کسی وقت بھی ڈال دیا جائے یہ اعلان نشر کر دیا گیا' ہر شخص نے حکم کے مطابق عمل کیا۔ صبح کے وقت جب حوض کا ڈھکنا اٹھایا گیا تو وہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ ہر شخص نے یہ سمجھا کہ اتنے بڑے حوض میں ایک بالٹی پانی کا کیا پتہ چلے گا۔ اس سے اندازہ ہو گیا کہ قوم کس درجہ کرپٹ ہو چکی ہے۔

یہ قصہ اس وقت یاد آیا کہ جب حزب اختلاف کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ایک اعلیٰ اختیاری کمیٹی بنائی جائے جو ملک میں "کرپشن" کا جائزہ لے۔ ایوان نے اپنی اکثریت کے بل پر اسے مسترد کر دیا۔ اس سے اندازہ ہو گیا کہ کرپشن کو کن مقتدر لوگوں کا تحفظ حاصل ہے اور جس ملک میں مقتدر لوگ کرپٹ ہو جائیں تو اس کے عوام کو اس کے جواز کا حق مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سطح پر اسے بہ چشم سر دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ چاہیں کہ اس معاشرے میں آپ کا کوئی کام قاعدے کے مطابق ہو جائے یہ ممکن نہیں۔ بے قاعدگی نے وبا کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور لوگ بھی بڑے اطمینان سے اس بے قاعدگی کو نبھا رہے ہیں۔ کوئی ایک محکمہ بھی ایسا نہیں جسے مثالی کہا جائے۔ اس کا اثر ہر شعبہ زندگی پر ہے۔ کھانے کی اشیاء سے لے کر برتنے کی اشیاء تک ملاوٹ اور دھوکہ کا شکار ہیں۔ اس معاشرے میں دولت کے بل پر انصاف خریدا جا سکتا ہے روپیہ کی حیثیت "مشکل کشا" کی ہو گئی ہے۔ بڑے سے بڑا مجرم اپنی قیمت ادا کر کے پولیس کی گرفت سے نکل جاتا ہے اور وہ لوگ جو ادائیگی کرنے کے قابل نہیں متعدد مقامات میں ملوث کر دیئے جاتے ہیں جب سے کراچی میں پولیس کو "فری ہینڈ" ملا ہے "کرپشن کا جمعہ بازار" لگا ہوا ہے۔ کوئی سننے والا اس لئے نہیں ہے کہ پولیس کو "اوپر" کی آشیر باد حاصل ہے۔ دنیا کی آنکھوں نے بھی ان درد بھرے مناظر کو دیکھ کر اپنی آنکھیں نم کر لی ہیں مگر ہمارے ارباب اقتدار کو شاید "رقوند" ہو گئی ہے جس سے نظر نہیں آتا۔

معاشرے سے یہ تصور معدوم ہو گیا ہے کہ ہر آدمی کے کندھوں پر دو فرشتے موجود ہیں جو نیک و بد اعمال مرتب کر رہے ہیں۔ ارباب اقتدار کے لئے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے آرڈی نینس کے ذریعہ فرشتوں کو بھگا دیا ہے جو جرائم کی تفصیل مرتب کر رہے تھے اب وہ نچنت ہو کر اپنے مذموم مقاصد میں لگے ہوئے ہیں۔ سندھ میں ۹۰ دن کے لئے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا داخلہ بند کر دیا گیا ہے یہ وہ شخص ہے جو اصلاح احوال کے لئے شب و روز کوشاں ہے پھر جس نے شیعہ سنی اتحاد کے لئے تجاویز بھی دی ہیں اور ان کے اکابرین سے ملاقاتیں بھی کی ہیں۔ وہ شخص جو اس ملک میں "خیر" کی علامت بن چکا ہے اس کے ساتھ یہ سلوک قابل مذمت ہے۔ آخرت کے تصور کی کوئی رمق ہوتی تو دل میں کچھ نرمی پیدا ہوتی۔ دل کی سختی بتاتی ہے کہ جواب دہی کا تصور سرے سے ختم ہو چکا ہے۔ وہ لوگ جو بے قصور مارے جا رہے ہیں یا جن کا جینا دوبھر کر دیا گیا ہے ان کی داد فریاد اگر اس دنیا میں نہ ہو سکی تو آخرت میں تو یقیناً ہو گی۔ اس وقت آج کے "بہادر" بے دست و پا ہوں گے اور انہیں کوئی جائے پناہ نہ مل سکے گی۔

جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے تو وہ یہ عقیدہ تو ضرور رکھتے ہیں کہ دو فرشتے ہمارے اعمال کو نوٹ کر رہے ہیں۔ مگر یہ عقیدہ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ وہ عمل پر موثر نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جھوٹ' دغا' فریب کا سکہ رواں ہے۔ ملاوٹ کوئی عیب نہیں رہی۔ کم تولنا معیوب نہیں رشوت اپنا حق بن چکا ہے۔ یہ اعراض ہر معاشرے میں کم و بیش پائے جاتے ہیں مگر ہمارے معاشرے میں تو اس نے ایک وبائی شکل اختیار کر لی ہے۔ چھوٹے بڑے ہر شخص سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ مذہبی شخصیتیں بھی اسی لپیٹ میں ہیں لوگ سوچتے ہیں "اب کسے رہنما کرے کوئی"۔

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں "الکتاب" کی شمع موجود ہے۔ اس کی جوت مدھم پڑ چکی ہے اس کی جوت کو جگانا ہے۔ پہلے بھی اس کتاب نے ظلمت کا پردہ چاک کیا تھا اور آج بھی اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ان تاریکیوں کو پھاڑ دے!

حامیان کتاب پر دوہری ذمہ داری آ چکی ہے کہ وہ اس کتاب کو پہلے خود حرز جاں بنائیں اور پھر معاشرے کو اس کے نور سے منور کریں۔ اس کیلئے بھی ہمیں وہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جو دور اول میں اختیار کیا گیا تھا۔ ایمان کی ایک بھرپور دعوت جو انسانوں کے دلوں میں اتر کر اسے توحید و آخرت پر استوار کر دے۔ اس عارضی دنیا کے عیش و عشرت کو ٹھکرا کر اللہ کے بندے دین کی سربلندی کیلئے نکل کھڑے ہوں۔ ایسے لوگوں کیلئے قرآن نے بڑی خوش خبریاں سنائی ہیں اور قرآن سے بڑھ کر سچا کون ہو سکتا ہے اور وہ لوگ جو اس راستے کے پتھر بنیں گے ان کیلئے بھی بے شمار وعیدیں قرآن میں موجود ہیں۔

اب ہمارا کام یہ ہے کہ ایسے مخلصین کو تلاش کریں اور اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے انکے دست و بازو بنیں پھر یقیناً ہم آخرت میں سربلند ہوں گے!!